جون 2015، قیمت 10 ₹

ماهنامه
بچوں کی دنیا
دهلی
Monthly BACHON KI DUNIYA, New Delhi

رمضان مبارک

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ اردو دنیا دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین ماہانہ عالمی جریدہ جسے آپ پوری دنیا میں اردو زبان کے کسی بھی ماہنامے سے بہتر پائیں گے۔ اردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا اور عام اردو قاری و ادبی حلقوں کی دلچسپی کے ساتھ طلبا و اساتذہ کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنے والا اردو کا ماہنامہ

ہر شمارے میں پڑھیے ،اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ، علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس، صحافت، نئی کتابوں پر تبصرے، قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں، سیمیناروں اور فروغ اردو سے متعلق نئی کاوشوں کا احوال اور بہت کچھ!

فی شمارہ: 15 روپے، سالانہ: 150 روپے

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

سہ ماہی فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال سے طلب کیجیے یا ہمیں لکھیے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066، فون: 26109746، فیکس: 26108159

E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

بچوں کی دنیا

جلد:3 شمارہ:6 جون 2015

اس شمارے میں

مدیر کا خط	آپس کی باتیں	مدیر	4
نظم	نازک کندھے بھاری بوجھ	حنیف کیفی	5
رمضان المبارک	پہلا روزہ	مناظر عاشق ہرگانوی	6
	پانی کا ذائقہ	محمد رفیع انصاری	7
کہانیاں	بدلاؤ	شکیل جاوید	8
	بے وفا طوطا	محمد نصیر رمضان	11
غیر ملکی کہانی	افغانستان کی لوک کہانی	ہما ملک	13
سائنس کی الف لیلہ	انگریزی نمک کی کہانی	سکلف اور سکلف	15
مضمون	اب آرہی ہے بلیٹ ٹرین	انیس الحسن صدیقی	20
	بلیک باکس	محمد اعجاز	24
دنیا کے بڑے لوگ	دنیا کا سب سے کامیاب سرجن	حسن نظامی	26

سیر کر دنیا کی غافل	تھائی لینڈ: قدرتی حسن کا شاہکار	محمد زاہد	28
کامکس کہانی	سند باد جہازی	ادارہ	31
نانی کا صندوق	نظم: جنگ کا انجام	میراجی	40
	کہانی: بھونچال آنٹی	رام لعل	41
نظم	ابو کی دعا	جاوید اکرم	44
قسط وار ناول	الٹا درخت	کرشن چندر	45
نظم	بارش اک انعام	فردوس گیاوی	52
اردو ایس ایم ایس	یہ مزے مزے کی حکایتیں	ادارہ	53
ننھے فنکار	بچوں کی تخلیقات	ادارہ	57
اردو فیس بک	بچوں کی باتیں	ادارہ	59
نظم	زندگی کا نشان ہے پانی	ریاض انور بلڈانوی	61
انٹرنیٹ سے	انوکھے منظر: ہمارے ریلوے پُل	ادارہ	62

مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

اعزازی مدیر: نصرت ظہیر

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارتِ ترقیِ انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

■ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

Total Pages: 64

صدر دفتر
فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000

شعبۂ ادارت: 11-49539009

ای میل
bachonkiduniya @ncpul.in
editor@ncpul.in

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in

شعبۂ فروخت: فون: 26109746
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم،
نئی دہلی-110066

ای میل: sales@ncpul.in
ncpulsaleunit@gmail.com

'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام NCPUL، شعبۂ فروخت کے پتہ پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں

شاخ 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002
فون: 24415194 - 040

آپس کی باتیں

لیجیے آخر وہ مہینہ بھی آ گیا جس میں گرمی تو زبردست پڑتی ہے لیکن بچّے خوب خوشیاں مناتے ہیں۔ کم از کم شمالی ہندوستان میں تو یہی ہوتا ہے۔ دن میں ہر طرف دھوپ ہی دھوپ۔ سورج غصّے سے آگ اگل رہا ہے۔ گھروں کی دیواریں اور چھتیں، محلّے کی گلیاں اور چبوترے، کھلے میدان، اور سڑکیں سب کے سب تپ رہے ہیں۔ دن میں ہی نہیں رات کو بھی گرم ہوائیں چلتی ہیں۔ لیکن بچّوں کو اس سب کی کیا پروا۔ سب مزے کرتے ہیں۔ اسکول کی سالانہ چھٹّیاں جو رہتی ہیں! اس لیے شملہ، مسوری یا سرینگر کی سیر ہو رہی ہے۔ صاف تالابوں اور نہروں میں نہانے کے بہانے 'چھو اچھو' کے چھینٹے اڑ رہے ہیں۔ ٹھنڈی صبحوں میں پتنگیں اڑائی جا رہی ہیں۔ ٹی وی پر کارٹون فلموں کی بہار ہے۔ لیکن جو بچّے سمجھ دار ہیں وہ اس موج مستی میں بھی پڑھائی کے لیے وقت نکالتے ہیں۔ اگلی کلاس میں جانے کے لیے خود کو تیار کرتے ہیں۔ اچھی اچھی کتابیں پڑھتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ بھی ان ہی میں شامل ہیں۔

اس مرتبہ جون کا مہینہ رمضان المبارک کو بھی ساتھ لا رہا ہے۔ وہ مہینہ جس میں خاص طور سے مسلمانوں کی آبادی والے علاقوں اور گھروں کا ماحول ایک دم بدل جاتا ہے۔ بازاروں میں رونق، مسجدوں میں روشنی، سحری میں دودھ جلیبی یا ایسی ہی کوئی شیرینی، افطار میں لذیذ نعمتوں سے سجے ہوئے دستر خوان، آئے دن دوسرے مذہبوں کے لوگوں کی طرف سے کی جانے والی افطار پارٹیوں کی دھوم...کل ملا کر پورا مہینہ ایک تہوار بن جاتا ہے۔ دوستو جیسا کہ آپ جانتے ہیں روزے کا مطلب صرف بھوکا پیاسا رہنا نہیں۔ روزہ صرف پیٹ کا نہیں جسم کے دوسرے حصوں کا بھی ہوتا ہے۔ آنکھ کا روزہ یہ ہے کہ وہ برا نہ دیکھے۔ کان کا یہ کہ وہ برا نہ سنے۔ زبان کا یہ کہ اس پر کوئی بری بات نہ آئے اور جو کہا جائے سچ کہا جائے۔ ہاتھوں کا یہ کہ وہ برا کام نہ کریں۔ پیروں کا یہ کہ وہ برائی کی طرف نہ اٹھیں۔ یہ سب نہ ہو تو روزہ ایک فاقہ بن کر رہ جاتا ہے جس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ لیکن رمضان تک محدود نہیں۔ یعنی ایسا نہیں کہ صرف رمضان میں سچ بولنا ہے اور باقی مہینوں میں جھوٹ بولنے کی چھوٹ ہے۔ جی نہیں، رمضان کے دنوں کی یہ عادتیں پوری زندگی کے لیے ہیں۔ آنکھ کان زبان اور ہاتھ پاؤں کے یہ 'روزے' ہمیشہ جاری رہنے چاہئیں! رمضان سے پہلے بھی، رمضان کے بعد بھی۔

رمضان چونکہ چاند کی تاریخوں والے مسلم کیلنڈر کے مطابق آتا جاتا ہے اس لیے ہر تینتیس 33 برس میں یہ تمام موسموں کا سفر مکمل کر لیتا ہے۔ اب یہ سخت ترین گرمیوں میں داخل ہو رہا ہے۔ اس لیے وہ سبھی لڑکے لڑکیاں جن پر عمر کے لحاظ سے روزہ فرض ہے روزے میں پوری احتیاط رکھیں۔ جہاں تک ممکن ہو دھوپ سے بچیں۔ زیادہ گرمی لگے تو جسم کو پانی سے تر کرتے رہیں۔ افطار و سحری کے درمیان خوب پانی پئیں۔ اناپ شناپ چیزیں کھانے سے بچیں۔ اس کے علاوہ جو بچّے والدین کی اجازت سے زندگی کا پہلا روزہ رکھیں وہ اس نئے تجربے کے بارے میں چھوٹا سا مضمون ہمیں لکھ بھیجیں، ہم ان کی تحریر آئندہ شماروں میں شامل کریں گے۔

اب چلتے چلتے ہمارا بھی ایک خوش گوار تجربہ سن لیجیے۔ ایک روز دفتر میں این آئی ٹی آر کے ریٹائرڈ پروفیسر آف ایجوکیشن، ڈاکٹر پی این مینن کا فون آیا اور انھوں نے 'بچّوں کی دنیا' کی اس قدر تعریفیں کیں کہ ہم آپ کو کیا بتائیں۔ گفتگو کے بعد انھوں نے یہ ای میل میسیج بھیجا:

''ڈیئر اکرام الدین صاحب! ٹیلی فون پر ہوئی گفتگو کے حوالے سے عرض ہے کہ میں ایک ریٹائرڈ پروفیسر ہوں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد میری اردو سیکھنے کی خواہش ہوئی اور میں نے ہریانہ اردو اکیڈمی کے اردو سرٹیفکیٹ کورس میں داخلہ لے لیا۔ اکیڈمی کے اساتذہ سے اردو سیکھنے میں مجھے بڑی مدد ملی۔ ایک روز میں اکیڈمی کے دفتر گیا تو ایک ٹیچر نے مجھے یہ رسالہ 'بچّوں کی دنیا' دے کر کہا کہ اسے پڑھا کیجیے۔ میں نے پڑھا تو مجھے اس کی زبان بہت خوب صورت، سیدھی سادی اور سمجھنے میں اپنے جیسے 'اردو کے بچّے' کے لیے بے حد آسان لگی۔ آپ کا بے حد شکر گزار ہوں!''

دیکھا آپ نے، آپ کا یہ رسالہ اردو سیکھنے والوں کے بھی کتنا کام آ رہا ہے! اچھا، اب اجازت دیجیے، اور اس موسم میں اپنا پورا خیال رکھیے۔

(ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین)

نظم

□ حنیف کیفی

نازک کندھے بھاری بوجھ

مجھ پہ جو روز گزرتی ہے بتاؤں کیسے
بھاری بستہ ہے یہ کاندھے پہ اٹھاؤں کیسے
بوجھ یہ لے کے میں اسکول کو جاؤں کیسے

رہ گیا دب کے کتابوں تلے بچپن میرا
پڑھنا لکھنا ہی مرا، بن گیا دشمن میرا
دل کو میں کھیل کھلونوں میں لگاؤں کیسے

وقت سونے کا ہے اٹھنے کے لیے ہوں مجبور
آنکھیں ملتے ہوئے اٹھتا ہوں کہ اٹھنا ہے ضرور
چین کی نیند جسے کہتے ہیں پاؤں کیسے

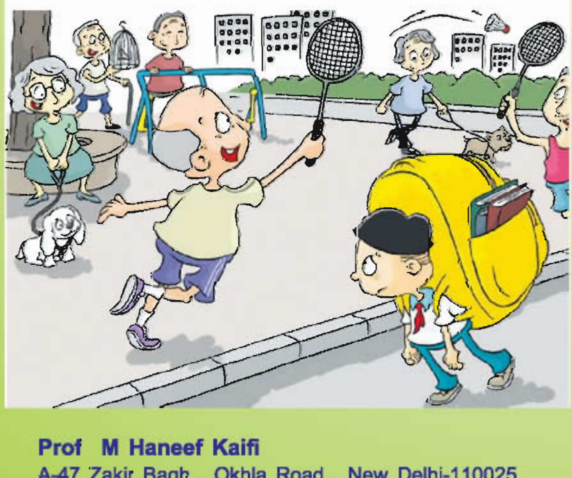

ڈر لگا رہتا ہے یہ چھوٹ نہ جائے کہیں بس
اور اسکول کے ٹائم پہ مرا کچھ نہیں بس
اپنی مرضی پہ بزرگوں کو چلاؤں کیسے

مجھ پہ جو روز گزرتی ہے بتاؤں کیسے
بھاری بستہ ہے یہ کاندھے پہ اٹھاؤں کیسے
بوجھ یہ لے کے میں اسکول کو جاؤں کیسے

Prof M Haneef Kaifi
A-47 Zakir Bagh, Okhla Road, New Delhi-110025

مناظر عاشق ہرگانوی/محمد رفیع انصاری

پہلا روزہ

رمضان کا مبارک مہینہ آ چکا تھا۔ دادا، ابّا، امّاں، سبھی روزے سے تھے۔ میری عمر پانچ یا چھ سال کی رہی ہوگی۔ ایک روز ضد پکڑ لی کہ کل روزہ رکھوں گا۔ سبھی نے منع کیا کہ دن بھر کچھ کھانے کو نہیں ملے گا۔ پانی بھی نہیں پینا ہے۔ اور یہ کہ پڑھائی بھی کرنی ہوگی۔ ابھی دو مہینہ پہلے ہی اسکول میں نام لکھایا گیا تھا۔ وہاں جانا اچھا لگتا تھا۔ میں نئے دوستوں کو بتانا چاہتا تھا کہ روزہ رکھ کر آیا ہوں۔

گھر والوں کو دھمکی بھی دی تھی کہ روزہ نہ رکھنے دیا تو چار منزلہ مکان کی چھت سے کود کر جان دے دوں گا۔

ابّا نے حیرت سے کہا، ''ہمارے گاؤں میں چار منزلوں والا مکان ہے ہی کہاں؟''

میں نے کہا تھا، ''تو کیا ہوا، کسی دو منزلہ مکان سے دو مرتبہ کود جاؤں گا۔''

ننھے دوستو. رمضان المبارک کے موقع پر اس مرتبہ ہم اپنے قلم کاروں کے پہلے روزے کی یادیں پیش کر رہے ہیں۔پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی اردو کے مشہور کہانی کار، شاعر، نقاد اور مصنف ہیں۔ اب تک ڈیڑھ سو سے زیادہ کتابیں لکھ چکے ہیں ۔اور اس سال کتابوں کی ڈبل سینچری مکمل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اردو کا کوئی بڑا ادیب ایسا نہیں جس پر انھوں نے کوئی کتاب نہ لکھی ہو۔ بچّوں کے لیے لکھنے پر انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ مل چکا ہے۔ یہاں وہ اپنے پہلے روزے کی باتیں بتا رہے ہیں۔بھیونڈی مہاراشٹر کے محمد رفیع انصاری بھی بچوں کے بزرگ قلم کار ہیں اور پہلے روزے کو یاد کررہے ہیں۔ہم ان تحریروں کے لیے شکر گزار ہیں۔ ن ظ

آخر مجھے اجازت مل گئی۔ میں نے روزہ رکھ لیا۔ اسکول جانے سے پہلے ٹفن مانگنے گیا تو امّاں نے کہا، ''روزے سے ہو۔ ٹفن کا کیا کروگے؟''

بستہ اٹھا کر اسکول چلا گیا۔ وہاں دوستوں کو بتایا تو کسی کو یقین نہ آیا کہ میں نے روزہ رکھا ہے۔ مجھے برا لگا۔ اس وقت تو اور بھی برا لگا جب سبھی ساتھی اپنا اپنا ٹفن کھول کر کھا رہے تھے اور میں انھیں چپ چاپ دیکھ رہا تھا۔ گھر پہنچا تو بھوک اور پیاس نے بے حال کر دیا تھا۔ بہت جی چاہا کہ پانی پی لوں۔ باتھ روم تک گیا کہ وہاں کون دیکھے گا؟ مگر ہمت نہیں ہوئی۔ دادا جان نے صبح سویرے ہی سمجھایا تھا کہ روزہ رکھنے سے خدا کا بھروسہ حاصل ہوتا ہے، اس کی خوشنودی مل جاتی ہے۔ اگر کچھ کھا لیا یا پی لیا تو گناہ ہوگا اور یہ کہ اللہ کی طرف سے سزا ضرور ملے گی۔ میں ڈر گیا۔ یہ تو خدا کو دھوکا دینے والی بات تھی۔ اس لیے پانی پینے کا ارادہ ترک کر دیا۔

لیکن میری حالت غیر ہوتی چلی گئی۔ بستر پر لیٹ گیا۔ سو بھی گیا۔ مگر بھوک اور پیاس نے جلدی ہی جگا دیا۔ بہت کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ گھر والے بھی میری حالت دیکھ کر فکر مند تھے۔ ابّا میرے پاس بیٹھ کر کہانیاں سنانے لگے۔ لیکن بادشاہ اور جن پری کی کہانیاں بھی مجھے

اچھی نہیں لگیں۔

جیسے تیسے دن بیتا۔ شام ہوئی اور خدا خدا کر کے افطار کا وقت ہوا۔ کھجور اور شربت سے روزہ کھولا۔ سبھی خوش ہوگئے۔

آج اس دن کی یاد آتی ہے تو لگتا ہے کہ خوشی حاصل کرنے کے لیے دکھ سے مقابلہ کرنا ضروری ہے۔ اور اس مقابلے کے لیے صبر کرنا ضروری ہوتا ہے۔ صبر سے ہی انسان کو طاقت ملتی ہے۔ □

پانی کا ذائقہ!

یہ پچاس برس پہلے کی بات ہے، جب میں نے پہلا روزہ رکھا تھا۔ اُس روزے کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ میں نے روزہ تو رکھ لیا لیکن کسی کو یہ بات بتائی نہیں۔ افطار سے تھوڑی دیر پہلے جب گھر والوں کو معلوم ہوا تو وہ حیران رہ گئے۔ وہ مجھے ایسے دیکھنے لگے جیسے میں آدمی نہیں کوئی جن ہوں۔

میں نے یہ بات کیوں نہیں بتائی، اِس کی ایک وجہ تھی۔ مئی کا مہینہ تھا۔ گرمی اپنے عروج پر تھی۔ روزہ دار بڑوں کی حالت روزے میں خراب رہتی تھی تو میں کم زور بچہ بھلا اس کی تاب کیسے لا سکتا تھا۔ موسمِ گرما کا یہ بُرا حال دیکھ کر میری والدہ اور دادا مجھ پر روزہ رکھنے کے لیے زور بھی نہیں دے رہے تھے۔ مگر میرا دل روزہ رکھنے کو چاہتا تھا۔

پیارے بچو آج سے آدھی صدی پہلے کا زمانہ، آج سے بہت الگ تھا۔ نہ سب گھروں میں بجلی تھی جیسی کہ آج کل ہوا کرتی ہے۔ نہ گھروں میں بجلی کے پنکھے فرفر گھومتے تھے۔ نہ ریفریجریٹر کا وجود تھا اور نہ زندگی کی دوسری آسانیاں میسّر تھیں۔ بڑے سخت دن تھے۔ ہر روز امتحان سے گزرنا پڑتا تھا۔ ہمارے بزرگ کتنے محنتی تھے۔ کتنے صبر کرنے والے اور کتنے سیدھے سادے لوگ تھے۔ کاش ہم بھی ایسے ہوتے۔

اب پورے دن کا احوال سنیے۔ مجھے پیاس کی شدّت کا احساس تو ہوا لیکن جی میں روزہ رکھنے کا پکّا ارادہ تھا اس لیے برداشت کی قوت بڑھ گئی تھی۔ آدھا دن یعنی دوپہر تک روزہ خوروں کو دل ہی دل میں کوستا رہا۔ ’کیسے لوگ ہیں، دن بھر کھاتے پھرتے ہیں۔ روزہ رکھ کر دیکھیں تو پتہ چلے کہ بھوک کیا ہوتی ہے؟ پیاس کیا ہوتی ہے؟‘

شام ہونے کو آئی تو باورچی خانے میں امّی کے پاس چلا گیا۔ پوچھا ’’آج کیا بنا رہی ہیں؟‘‘ اور پھر ان کا جواب سنے بغیر کہہ دیا۔ ’’آج چاہے جو بھی پکانا، لیکن امّی! پکوڑے اور چھولے بنانا ہرگز نہ بھولنا۔‘‘

اسی دوران میری بہن نے میرے روزے کا راز کھول دیا۔ پھر کیا تھا، سارا منظر ہی بدل گیا۔ سبھی میری خاطر داری میں لگ گئے۔ البتہ دادی جان فکر مند ہوگئیں۔ کیوں! اس لیے کہ میں روزانہ شام کو برف خرید کر لاتا تھا۔ اُن دنوں ’برف‘ بہت قیمتی چیز ہوا کرتی تھی۔ اس کی مانگ بھی گرمیوں میں سب سے زیادہ رہتی تھی۔ افطار سے پہلے برف کی فیکٹری پر ایسا ہجوم ہوتا تھا جیسے کوئی میلہ لگا ہو۔ برف لوگ عین وقت پر خریدتے تھے تاکہ وہ پگھل کر ختم نہ ہو جائے۔ جس دن برف نہ ملتی اس دن دادی جان آگ بگولا ہو جاتی تھیں۔

اُس دن میرے ابّو نے برف کا انتظام خود اپنے ذمّے لے لیا۔

لو بھئی خدا خدا کر کے افطار کا وقت ہوگیا۔

اذان ہوئی تو جانتے ہیں میں نے کیا کیا! میں نے پانی سے بھرا گلاس منہ سے لگا لیا۔ پانی کا پہلا گھونٹ پیتے ہی ایسی راحت کا احساس ہوا کہ کیا بتاؤں۔ آج پچاس برس بیتنے کے بعد بھی اُس کی لذّت محسوس کرتا ہوں۔ سچ ہے پانی بڑی نعمت ہے۔ یہی میرے پہلے روزے کا خلاصہ ہے۔ □

شکیل جاوید

بدلاؤ

امّی اسپتال سے لوٹیں تو ان کی گود میں گڈا تھا۔ سچ مچ کا گڈا۔

شموخوشی خوشی امّی کے پاس پہنچا۔ انھوں نے گدیلیے میں لپٹے ہوئے گول مٹول پیارے پیارے گڈے کو دکھایا۔

''دیکھو شمو بیٹے اللہ نے تمھیں بھائی دیا ہے۔ تم اکیلے تھے اب اس کے ساتھ کھیلنا۔''

وہ گہری خاموشی سے پہلے تو ٹکر ٹکر اس نئے مہمان کو دیکھتا رہا، جس کے بارے میں اس کی امّی نے بتایا تھا کہ یہ تمھارا بھائی ہے۔ اس نے اس کے ننھے ننھے ہاتھوں اور ٹانگوں کو غور سے دیکھا اور پھر چہک کر بولا ''امّی، امّی بھیا کے ہاتھ بھی ہیں اور ٹانگیں بھی؟''

''ہاں بیٹے بالکل تمھارے جیسا ہے جب یہ تمھاری طرح بڑا ہوجائے گا تو اسے بھی اپنے ساتھ اسکول لے جانا۔ تمھاری طرح یہ بھی پڑھائی کیا کرے گا۔''

یہ سب دیکھ کر، سن کر، اس کے ننھے دماغ میں عجیب عجیب سی باتیں آنے لگیں اور پھر ایک عجیب سی لہر خون بن کر اس کی رگ رگ میں دوڑنے لگی۔ وہ سوچنے لگا، شاید اسی چیز کو خوشی کہتے ہیں۔ اسے آج پہلی بار اس کا احساس ہوا۔

رات میں جب اسے نیند آنے لگی تو اس نے امّی سے کہا ''امّی مجھے نیند آرہی ہے۔''

''شمو بیٹے! آج سے تم اپنے نئے بستر میں الگ سوؤ گے ورنہ منا تمھارے کپڑے خراب کردے گا۔ یہ شوشو کرتا ہے۔''

''نہیں امّی میں تو تمھارے پاس ہی سوؤں گا، مجھے الگ مت کرو۔'' شمو نے مچل کر کہا۔

امّی نے شمو کو نئے بستر میں لٹا کر کہا ''اب ہمارا بیٹا سیانا ہوگیا ہے، بہت سمجھ دار ہے۔'' اس کی تعریف کرتے ہوئے بہت سی باتیں اسے سمجھائیں۔ اب ان باتوں کا مطلب شمو کی سمجھ میں آیا یا نہیں پھر بھی امّی نے بہلا پھسلا کر اسے نئے بستر میں لٹا ہی دیا۔

یہ نیا بستر جو ایک کھٹولے پر لگایا گیا تھا اس کے لیے قطعی اجنبی تھا۔ وہ لیٹ کر اجنبی بستر میں ایڈجسٹ ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن اس کے پاس بہت سے سوال تھے، وہ سوچنے لگا تھا۔

امّی نے آج اپنے پاس نہیں سلایا، میں تو روز ان کے پاس سوتا ہوں۔ وہ کہتی ہیں اب میں سیانا ہو گیا ہوں۔ میں نے پوچھا یہ سیانا کیا ہوتا ہے؟ وہ بولیں اب تم بڑے ہو گئے ہو۔ شاید اسی لیے انھوں نے کوئی کہانی بھی مجھے نہیں سنائی۔ میں کہانی سنتے سنتے بے خبری کی نیند سو جایا کرتا تھا۔ پر آج میری آنکھوں سے نیند کہاں چلی گئی؟ پہلے جب مجھے نیند نہیں آتی تھی تو امّی مجھے لوری گا کر سناتی تھیں۔ جسے سنتے ہی میں سو جایا کرتا تھا۔ لیکن آج مجھے نیند کیوں نہیں آ رہی ہے؟ شاید اسی لیے کہ آج پہلی بار اکیلا سو رہا ہوں۔

ایسے ہی نئے نئے سوالوں میں الجھا ہوا، وہ دیر رات تک جاگتا رہا۔ ایک طرف اگر اسے اپنے ننھے منے بھائی کے آنے کی خوشی تھی تو دوسری جانب اس کے ذہن میں مکڑی کے جال کی طرح سوالوں کا جال تھا، جس میں سوچ اور فکر تھی۔ ہر سوال کے اندر چھپے ہوئے ان گنت سوال تھے جن کے جواب اس کے ننھے دماغ میں نہیں تھے۔ بستر آرام دہ تھا اور نیا بھی لیکن اس نے پوری رات ایک عجیب سی بے چینی کے ساتھ سوتے جاگتے کاٹی۔

جس دن اس کی امّی منے کو اسپتال سے لے کر آئی تھیں، اس کے اسکول کی چھٹی تھی۔ اور دوسرے دن اتوار، اس کے پاس کوئی ہوم ورک بھی نہ تھا۔ وہ خوشی خوشی منے کے پاس بیٹھا رہا۔ طرح طرح کی باتیں کرتا رہا جن کا جواب اسے نہیں معلوم تھا۔

امّی کی آواز پر صبح اٹھا تو اسے چاروں طرف سے سوالوں نے گھیر لیا۔ مگر یہ سب تو اس کے معمولات میں تھا۔ اس نے نہا کر اسکول جانے کی تیاری کی۔ اسکول کی ڈریس، موزے پہنے، ٹائی بھی خود باندھی، جوتے پر پالش بھی کی، لیکن شو پہننے کے بعد تسمے کوشش کے بعد بھی نہ باندھ سکا تو امّی کے پاس آیا۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے تسمے باندھے، بالوں میں تیل لگا کر کنگھا کیا۔ ناشتہ کر کے اسکول کا بیگ اٹھائے وہ 'خدا حافظ' کہہ کر گھر سے نکل گیا۔

اسکول سے واپس آ کر اس نے ڈریس اتاری، پہلے ڈریس اتار کر وہ یوں ہی ڈال دیا کرتا تھا۔ امّی کے ہزار کہنے پر بھی کبھی اس نے اپنی ڈریس تہہ کر کے یا سنبھال کر نہیں رکھی تھی، لیکن آج ڈریس اتارنے کے بعد اسے ایک آواز سنائی دی، جیسے وہ آواز اس کے اندر سے آ رہی تھی۔

''شمو! اپنی ڈریس اتار کر خود ہی سنبھال کر رکھو۔ اب تم سیانے ہو گئے ہو اپنا کام خود کیا کرو۔'' اس نے خاموشی سے اندرونی آواز کی تعمیل کی۔

پھر اسے دوسری آواز نے چونکا دیا ''اپنے اسکول کا کام بھی تو تم خود ہی کرتے ہو اور اپنا ہوم ورک بھی۔'' بات سیدھی سچی تھی، اس نے ان باتوں کو اپنے ذہن میں بٹھا لیا۔

اس دن شمو اسکول سے گھر آیا، ڈریس بدلی، امّی سے کھانا مانگا، امّی اس وقت منے کو دودھ پلا رہی تھیں۔ وہیں سے بولیں ''نعمت خانہ میں روٹی کا ڈبہ رکھا ہوا ہے اور اسی کے ساتھ آملیٹ بھی ہے سنبھال کر نکال لو۔ دیکھو کوئی برتن نہ ٹوٹے؟''

امّی کا یہ روکھا جملہ اس کے دل پر کسی گھونسے کی طرح لگا۔ ایسا تو انہوں نے کبھی نہیں کہا تھا۔ آج امّی نے پہلی بار یہ روکھا پن دکھایا ہے۔ ورنہ بڑے بڑے نقصان پر بھی انہوں نے کبھی کچھ نہیں کہا۔ وہ کوئی ایسا نادان بھی نہ تھا جو کھٹے میٹھے میں فرق نہ سمجھے۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح اس نے زہر مار کر کے کھانا کھا ہی لیا۔

اب وہ اپنے کمرے میں خاموشی سے لیٹا ہوا ان تبدیلیوں کے بارے میں سوچ رہا تھا جو ایک کے بعد ایک چلتی پھرتی تصویروں کی طرح اس کے سامنے آ رہی تھیں۔

جب وہ چھوٹا تھا، اور ٹھیک سے چل پھر بھی نہیں سکتا تھا، اس

وقت سبھی لوگ اسے چومتے اور لاڈ پیار کرتے تھے۔امّی ان دنوں کی باتیں بتاتی تھیں کہ کوئی اِدھر سے مانگتا کوئی اُدھر سے گود میں اٹھالیتا اور یوں ہی دن تمام ہوجاتا تھا۔خود امّی تو بس دودھ پلانے کے لیے اسے گود میں لیتی تھیں۔سب کی آنکھوں کا تارہ تھا وہ۔کچھ باتیں اس نے ہوش سنبھالنے پر دیکھی تھیں اور یہ سب محسوس بھی کیا تھا۔سبھی لوگ کتنا چاہتے تھے اسے۔گھر میں سبھی کا لاڈلا تھا وہ۔

لیکن اب کیا ہوا ان سبھوں کو۔یہ تبدیلی کیسی؟ یہ کیسا بدلاؤ ہے؟

ایسے ہی نہ جانے کتنے سوال جونک بن کر اس کے ذہن کو چمٹ گئے تھے۔لیکن اس کے ننھے دماغ میں اس کا جواب نہ تھا۔یہی سوچ سوچ کر اکثر اس کا سر بھاری ہوجاتا، اور مزاج میں چڑ چڑا پن بھی آجایا کرتا۔ایک طرف اسے بھائی کے گھر میں آنے کی خوشی ہوتی تھی مگر ساری تبدیلیاں بھی تو اسی کے آنے کے بعد ہی آئی تھیں۔کہیں وہی تو اِن تبدیلیوں کی وجہ نہیں؟

ایک دن اس نے اپنے دوست کاشف سے ان پریشانیوں کا ذکر کر کے ان کا حل پوچھا۔وہ اس کے بھائی جیسا تھا۔وہ اس سے کچھ بھی نہیں چھپاتا تھا۔کئی بار اس کے گھر بھی جاچکا تھا۔اس کی امّی بڑا پیار کرتی تھیں اسے۔کاشف نے اسے بڑے پتے کی بات بتائی۔

"شمو تمھاری باتوں کا حل بڑوں کے پاس مل سکتا ہے تم اپنی باتوں کو میری امّی کے سامنے رکھو۔ان کے پاس ضرور اس کا حل ہوگا۔"

دوسرے دن اتوار تھا۔شمو پروگرام کے مطابق کاشف کے گھر پہنچا اور اس کی امّی کو ایک ایک بات بتائی۔اپنے ساتھ ہوئی ان تبدیلیوں کا ذکر کیا۔اس کی ساری باتیں سن کر کاشف کی امّی نے اسے سمجھایا۔

"دیکھو شمو بیٹے! جب تم اپنے گھر میں اکیلے تھے۔سبھی کا لاڈ پیار تم پر تھا، کیونکہ اس وقت تم چھوٹے بہت چھوٹے تھے، اتنے چھوٹے کہ تم کو سہاروں کی ضرورت تھی۔اب ماشا اللہ تم سیانے ہوگئے ہو۔اپنا کام خود کرسکتے ہو جیسے اپنے اسکول کا کام بھی تم خود ہی کرتے ہو۔اب تمہیں چھوٹے چھوٹے سہاروں کی ضرورت نہیں، کیونکہ اب تم

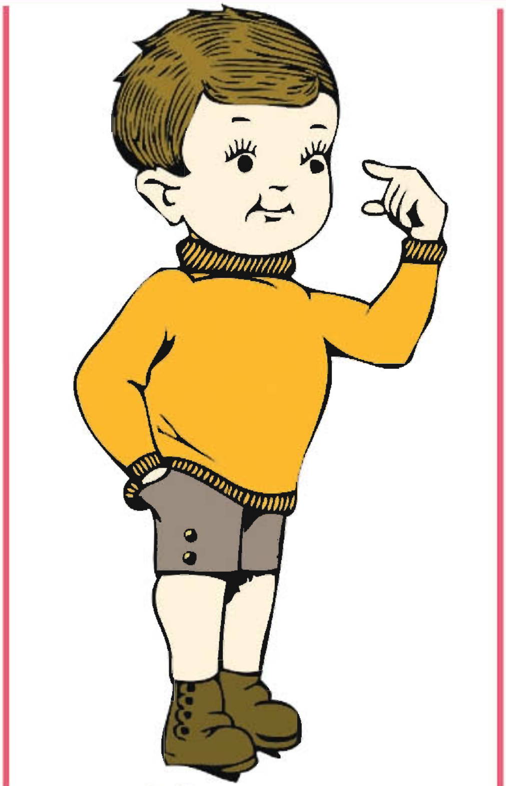

آہستہ آہستہ بڑے ہو رہے ہو۔اپنے کام خود کرسکتے ہو۔"

انہوں نے شمو کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"اب اللہ نے تمہیں ایک بھائی دیا ہے۔ننھا منا سا پیارا سا۔اس کو بھی اسی طرح سہاروں کی ضرورت ہے جس طرح کبھی تمھیں تھی، جب تم بھی اس کے برابر کے تھے۔ایک دم اس جیسے ــــــ دیکھو بیٹا! یہ بدلاؤ، یہ تبدیلیاں زندگی میں آتی ہیں۔جیسے جیسے عمر بڑھتی ہے۔اسی طرح سمجھ بھی بڑھتی ہے۔اس میں کسی کو الزام دینا ٹھیک نہیں۔ابھی تو تمھیں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔لیکن ان سے گھبراؤ نہیں، ہر چیز کا حل نکل آتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ خدا سمجھ بھی دیتا ہے۔"

کاشف کی امّی کی کہی ایک ایک بات شمو کے دل میں اتر گئی۔

گھر واپس جاتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا، کیا واقعی میں سیانا ہوتا جارہا ہوں، بڑا ہو رہا ہوں! □

Shakeel Javed
Bazar Shafa'at Pota Amroha -244221

کہانی

محمد نصیر رمضان

بے وفا طوطا

صحن میں دھپ سے کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی۔ گھر کے افراد ایک ایک کر کے کمرے سے نکل آئے کہ دیکھیں کیا ماجرا ہے۔ سب سے پہلے ثمرین کی نظر پڑی۔

''وہ دیکھیے دادی... کیا ہے۔'' اس نے اپنی دادی کو بتایا۔ سبھی جلدی سے اس چیز کے قریب پہنچے۔ دیکھا تو وہ ایک طوطا تھا جو کہ زخمی حالت میں تھا۔ ایک طرف سے اس کا پنکھ ٹوٹا ہوا تھا۔ شاید کسی چیل وغیرہ نے اسے زخمی کر دیا تھا اور اب وہ اڑنے سے مجبور ہو گیا اور گر پڑا تھا۔

''دیکھیے... دادی کتنا پیارا ہے۔'' ثمرین نے زہرہ بیگم سے کہا۔

''ہاں... ٹھہرو! تم لوگ اسے ہاتھ مت لگاؤ'' یہ کہہ کر زہرہ بیگم نے زخمی طوطے کو آرام سے ہاتھ میں اٹھایا اور صحن میں بچھے پلنگ پر بیٹھ گئیں۔

''بہو ذرا ہلدی اور سرسوں کا تیل تو لانا'' ثمرین کی دادی نے اپنی بہو یعنی ثمرین کی ماں سے کہا۔ وہ فوراً ہلدی

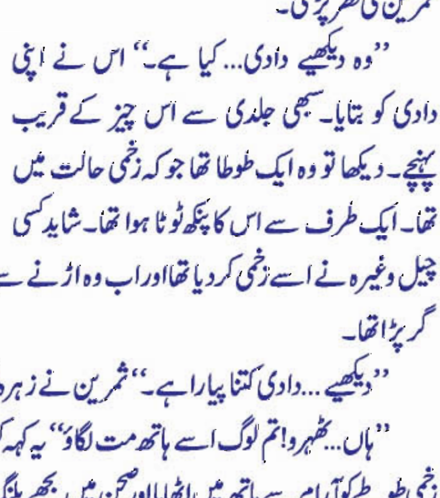

اور سرسوں لے آئیں۔ اب زہرہ بیگم نے جلدی سے ہلدی اور سرسوں ملا کر لیپ تیار کیا اور طوطے کے زخمی بازو پر لگانے لگیں۔ طوطا پھڑ پھڑا کر رہ گیا۔ شاید اسے تکلیف ہو رہی تھی۔ ثمرین غور سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔

''دادی کیا یہ مر جائے گا۔'' چھ سالہ ثمرین نے دادی سے پوچھا۔

''نہیں بچّی... یہ ٹھیک ہو جائے گا۔'' دادی نے لیپ لگاتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر بعد زہرہ بیگم نے طوطے کو ایک ٹوکری کے نیچے رکھ دیا اور اوپر سے وزن رکھ دیا تا کہ ٹوکری ہلنے نہ پائے۔

''دادی آپ نے یہ کیا کر دیا۔'' ثمرین نے پوچھا۔

''کچھ نہیں بیٹا یہ اس کی حفاظت کے لیے ہے... تا کہ کوئی بلی نہ اسے کھا لے۔'' زہرہ بیگم نے سمجھایا ''اب یہ شام تک تھوڑا سا ٹھیک

ہو جائے گا۔'' گھر کے افراد دوبارہ کمرے میں چلے گئے اور ثمرین ٹوکری کے پاس بیٹھ کر اسے دیکھنے لگی۔

شام کو دادی نے ٹوکری اٹھا کر دیکھا۔ طوطا چپ چاپ بیٹھا تھا مگر پہلے سے اس کی حالت کافی بہتر تھی۔ اچانک طوطے نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اس سے پہلے وہ بے ہوشی کی سی کیفیت میں تھا۔ یہ دیکھ کر دادی مسکرادی۔ ثمرین بھی ہنسنے لگی جو کہ اس دوران بڑے اشتیاق سے طوطے کو دیکھ رہی تھی۔ دادی نے ایک امرود اور روٹی کے چند ٹکڑے اس کے آگے رکھ دیے اور ساتھ ہی ایک کٹوری میں پانی بھی۔ طوطے نے ایک روٹی کا ٹکڑا اٹھا کر اسے کترنا شروع کر دیا۔

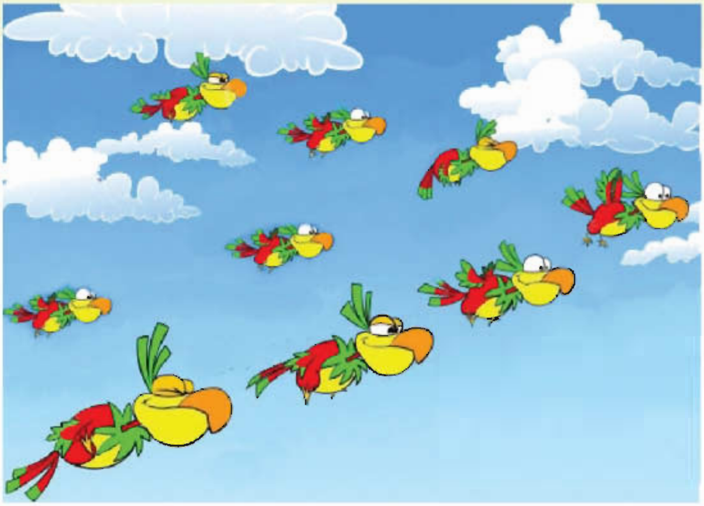

''کیا یہ طوطا اب اچھا ہو جائے گا۔'' ثمرین نے دادی سے پوچھا۔

''ہاں! اور تم دیکھنا یہ کچھ دنوں میں اڑنے بھی لگے گا۔''

دادی نے مسکرا کر ثمرین کی طرف دیکھا۔

''میں اسے رکھ لوں گی دادی۔ اسے پنجرے میں رکھیں گے۔''

''ہاں... ہاں ٹھیک ہے... پہلے اسے اچھا تو ہو لینے دو۔''

کچھ دنوں میں ہی طوطا اچھا ہو گیا۔ ثمرین کی ضد پر اس کے ابّو طوطے کے لیے پنجرہ لے آئے۔ اب طوطا پنجرے میں ہی رہتا، اس کا کھانا پانی پنجرے میں ہی دے دیا جاتا۔ روز ثمرین کبھی ہری مرچ کبھی، بسکٹ، کبھی مٹھائی اور روٹی کا ٹکڑا پنجرے میں ڈال دیتی اور طوطا اسے کھاتا رہتا، پھر وہ ٹائیں ٹائیں بھی کرنے لگا۔ اب گھر کے افراد اس کے عادی ہو چکے تھے۔ ثمرین کی تو جیسے اس میں جان تھی وہ ہر وقت اس کے ساتھ لگی رہتی یہ دیکھ کر دادی مسکراتی رہتی۔ اب تو طوطے کو پنجرے سے تھوڑی دیر نکال کر ثمرین اس سے باتیں بھی کرتی رہتی۔ اس کا نام نکّو رکھ دیا گیا۔ طوطے کو بھی جیسے ان سے پیار ہو گیا تھا وہ کبھی ثمرین کے بازو پر اور کبھی سر پر بیٹھ جاتا اور چونچ سے گدگداتا۔ گھر کے افراد ثمرین کا طوطے سے لگاؤ دیکھ کر ہنستے۔

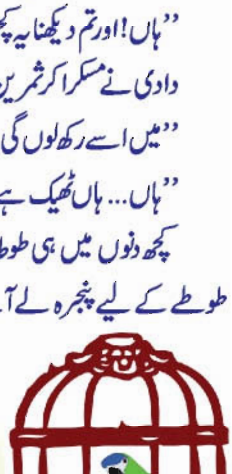

ایک دن ثمرین ایسے ہی طوطے کو پنجرے سے نکال کر کھیل رہی تھی کہ اچانک آسمان میں طوطوں کی ایک ڈار ٹائیں ٹائیں کرتی گذری۔ یہ دیکھ کر ثمرین کے ہاتھوں سے طوطے نے پھڑ پھڑا کر پلٹی کھائی اور کچھ دور اڑان بھر کر گر گیا۔ ثمرین چیخنے لگی۔ یہ دیکھ کر طوطے نے پھر آسمان کی طرف دیکھا اور اڑان بھری اور گھر کی چھت پر جا بیٹھا۔ شور سن کر سبھی ثمرین کے پاس آ گئے۔ انھوں نے بھی دیکھا کہ طوطا اڑ گیا ہے۔ وہیں چھت سے طوطے نے اور اڑان بھری اور آسمان میں گذر رہے طوطوں میں شامل ہو گیا۔ ثمرین رونے لگی۔ سب نے باری باری بہلایا۔ دادی نے پیار سے ساتھ لپٹا لیا۔

''بیٹا وہ آزاد پنچھی ہے۔ اسے اپنے جیسوں کے ساتھ ہی رہنا تھا۔''

''مگر دادی یہ ہمارا طوطا تھا۔'' ثمرین نے ہچکیوں کے درمیان روتے ہوئے کہا ''نہیں... بیٹا پنچھی آزاد ہی اچھے لگتے ہیں۔ جیسے ہم تم آزاد ہیں۔ انھیں قید نہیں کرنا چاہیے۔'' دادی نے رسان سے سمجھایا۔

ثمرین نے ایک بار پھر آسمان کی طرف دیکھا جہاں کسی پنچھی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ وہ ایک آہ سی بھر کر رہ گئی!

Mohd Naseer Ramzan
H No 445, Chormaran Maler Kotla - 148023 Punjab

افغانستان کی کہانی

❑ ترجمہ: ہما ملک

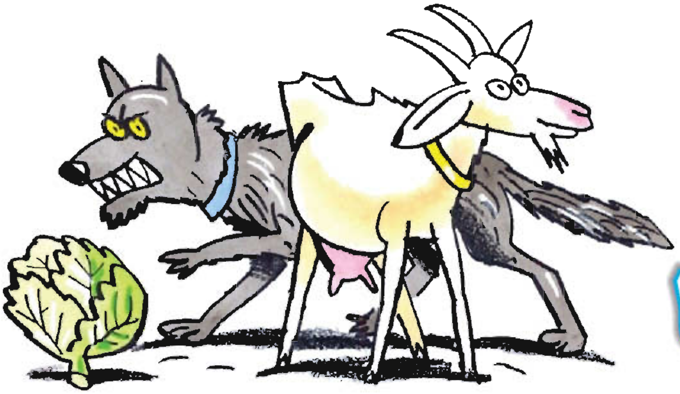

بکری اور بھیڑیا

ایک دفعہ کا ذکر ہے، ایک بکری تھی، جس کے دو سینگ تھے وہ ایک ہی وقت پر کبھی دکھائی دیتے تھے اور کبھی دکھائی نہیں دیتے تھے وہ تین بچوں کی ماں تھی۔ بڑے ہی خوبصورت تین چھوٹے بچے۔ اُن میں ایک کا نام، ہاکاک، دوسرے کا پوکاک اور سب سے چھوٹے کا سانگاک تھا۔

ایک دن بکری اپنے جھونپڑے سے باہر نکلی تاکہ اپنے بچوں کے کھانے کے لیے کچھ تلاش کر کے لائے۔ جب وہ اپنے جھونپڑے سے باہر، جنگل میں کچھ چارہ وغیرہ تلاش کر رہی تھی، ایک بھیڑیا آیا اور جھونپڑے کے اندر گھس کر بکری کے تینوں بچوں کو کھا گیا۔

بکری جب واپس گھر پہنچی تو اُسے اپنے بچے دکھائی نہ دیے۔ اُس نے انھیں اِدھر اُدھر تلاش کیا لیکن وہ کہیں بھی نظر نہ آئے اور، جب اُس نے جھونپڑے کے اندر جھانک کر دیکھا تو وہ بہت ہی غمگین اور اداس ہوگئی۔ ایک جگہ بیٹھ کر وہ سوچنے لگی کہ اس کے بچوں کے ساتھ آخر کیا ہوا ہوگا۔ تبھی اُسے بھیڑیے کا خیال آیا۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا تو اسے بھیڑیے کے پیروں کے نشان بھی دکھائی دیے۔ اب وہ سب کچھ سمجھ گئی تھی۔ بھیڑیا اُس کے تینوں بچوں کو کھا گیا تھا۔

اُس نے ایک اُونچی چھلانگ لگائی اور کئی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کو پھلانگتی ہوئی اُس پہاڑی پر جا اُتری جس کے ایک غار میں بھیڑیا رہتا تھا۔ اب وہ غار کی چھت کے اوپر کھڑی ہو کر بڑے زور زور سے اپنے کُھر مار رہی تھی۔

نیچے غار کے اندر سے بھیڑیا چلّا رہا تھا ''کون ہے جو میری چھت پر یوں پتھر کوٹ رہا ہے؟ ساری مٹی اور کنکر نیچے میرے معزز مہمانوں پر گر رہے ہیں اور اُن کا کھانا خراب کر رہے ہیں۔ ہر جگہ مٹی ہی مٹی پھیل رہی ہے اور میرے مہمانوں کے سروں پر جم رہی ہے۔ کون ہے اوپر چھت پر جو یہ حرکت کر رہا ہے؟''

''یہ میں ہوں، چینی بکری، جس کے ماتھے پر دو سینگ ہیں اور جو ایک ہی وقت پر کبھی دکھائی دیتے ہیں اور کبھی دکھائی نہیں دیتے۔ کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ میرے بچوں کو کون کھا گیا ہے؟ کس نے میرے، پوکاک کو کھایا ہے اور کون میرے ہاکاک اور میرے ننھے سانگاگ کو ہڑپ کر گیا ہے؟'' بکری بولی۔

''یہ میں تھا جس نے تمھارے ہاکاک کو کھایا ہے اور جو پوکاک کو بھی کھا گیا ہے۔ تمھارے سانگاک کو بھی میں نے ہی کھایا ہے۔'' بھیڑیے نے غار کے اندر ہی سے جواب دیا۔

''تم بڑے ظالم ہو! اس لیے کل تمھارے اور میرے درمیان لڑائی ہوگی۔ کل میں تمھارے ساتھ لڑوں گی!'' بکری بولی۔

''ہاہاہا! ٹھیک ہے، میں تمھیں دیکھ لوں گا۔ کل ہم دونوں

لڑیں گے۔'' بھیڑیا قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک دوپہر بعد ہماری لڑائی ہوگی۔''

اب بکری نے اپنے گھر پہنچ کر ایک بڑے کٹورے میں دودھ بھرا اور اُسے لے کر سیدھی لوہار کے ہاں جا پہنچی

'' ظالم بھیڑیا میرے معصوم ننھے بچوں کو مار کر کھا گیا ہے۔ میں تم سے عرض کرتی ہوں کہ میری کچھ مدد کرو۔ تم میرے سینگوں کو تیز ترین کردو، مجھے بھیڑیے سے لڑنا ہے۔ دیکھو میں یہ دودھ تمھارے لیے لائی ہوں تاکہ تمھارے کام کی اُجرت ادا کرسکوں۔''

لوہار نے بکری سے دودھ کا کٹورا لے کر ایک طرف رکھا اور پھر بکری کے سینگ تیز کرنے لگا۔ اس کے سینگ تلوار کی طرح تیز ہو گئے۔ اُن کی نوکیں تو بہت ہی تیز تھیں اور تیر کی انی کی طرح چمک رہی تھیں۔ بکری نے لوہار کا شکریہ ادا کیا اور گھر واپس چلی گئی تاکہ لڑائی کے لیے تیاری کرسکے۔

تھوڑی دیر کے بعد، غصّے میں بھرا، ظالم بھیڑیا بھی لوہار کے ہاں جا پہنچا۔ اُس کے پاس کنکروں اور گارے سے بھرا ہوا ایک پتیلا تھا۔

''یہ لو، اور میرے دانت تیز کردو، بکری کے ساتھ میری لڑائی طے ہوئی ہے میں اس پتیلے میں تمھارے لیے کھانا لایا ہوں تاکہ تمھارے کام کی اجرت ادا کرسکوں۔'' بھیڑیا لوہار کو پتیلا دیتے ہوئے بولا۔

لوہار نے پتیلے میں جھانکا تو اسے وہاں کنکروں اور گارے کے سوا کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ وہ بھیڑیے کی چال سمجھ گیا تھا۔ وہ سخت غصے میں تھا لیکن خاموش رہا۔ پھر جب بھیڑیے نے دانت تیز کرانے کے لیے اپنا منہ کھولا تو لوہار نے بڑی ہوشیاری اور چالاکی سے اُس کے دانتوں کو یوں اُکھاڑ کر باہر نکال دیا کہ بھیڑیے کو کچھ محسوس ہی نہ ہوا اور وہ سمجھتا رہا کہ لوہار اُس کے دانت تیز کررہا ہے۔

''اب تمھارے دانت سب سے تیز ہوچکے ہیں۔'' لوہار بولا۔ ''اب تم جاسکتے ہو۔''

اب مقررہ جگہ اور وقت پر بکری اور بھیڑیا ایک دوسرے کے سامنے کھڑے، لڑائی کے لیے تیار تھے۔

''پہلے تم حملہ کرو!'' بھیڑیے نے چلاّ کر کہا ''نہیں، پہلے تم وار کرو!'' بکری بھی اُتنے ہی زور سے چلاّ کر بولی۔

بھیڑیے نے یکدم اپنا منہ کھولا اور چھلانگ لگا کر بکری پر جھپٹ پڑا اور اُس کی گردن کو اپنے منہ میں دبوچ لیا۔ لیکن بھیڑیے کے تو دانت ہی نہیں تھے۔ بکری نے فوراً اپنی گردن چھڑالی۔ وہ بکری کی کھال تک کو کوئی نقصان نہیں پہنچاسکا تھا۔

اب بکری کی باری تھی۔ اُس نے اپنی گردن اونچی کی اور ماتھے پر اپنے سینگوں کو محسوس کرتے ہوئے، پوری طاقت کے ساتھ بھیڑیے کی جانب بڑھی اور پھر اُس نے بڑی پھرتی کے ساتھ اپنے دونوں سینگ بھیڑیے کے سینے میں گھونپ دیے۔ اُس نے بھیڑیے کے تھرکتے ہوئے پیٹ کو چیر کر اندر سے اپنے تینوں بچوں، ہاکاک، پوکاک اور مُنے سانگاک کو باہر نکال لیا۔ تینوں زندہ تھے۔ بکری اپنے تینوں بچوں کو زندہ سلامت دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ اس نے اُن کے سروں کو دھویا اور پھر وہ چاروں چوکڑیاں بھرتے اپنے جھونپڑے کی طرف روانہ ہوگئے۔ تب سے اب تک وہ وہاں بڑے آرام وسکون اور امن چین سے زندگی گذار رہے ہیں۔ □

Ms Huma Malik
Copenhagen, Denmark

مترجم: انیس الدین ملک / نظرِ ثانی: نصرت ظہیر

سائنس کی الف لیلہ

انگریزی نمک کی کہانی

انگلینڈ میں 1618 کی گرمی شدید تھی اور سرے Surray کے علاقوں میں پانی کی بے حد کمی ہوگئی تھی۔ یہ کمی اپسم Epsom کے چھوٹے گاؤں میں سب سے زیادہ محسوس کی جارہی تھی۔ مویشیوں کا پیاس سے برا حال تھا۔ ہنری ڈیکر کے پاس بھی دوسرے کسانوں کی طرح اپنی گایوں کے لیے بہت تھوڑا سا پانی تھا۔ ایک دن اپنے کھیتوں میں گھومنے کے دوران اسے ایک چھوٹا سا سوراخ نظر آیا۔ اسے بڑا تعجب ہوا کیونکہ سوراخ پانی سے بھرا تھا جبکہ بارش بہت دنوں سے نہیں ہوئی تھی۔ اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ نزدک ہی پانی کا کوئی چشمہ ہونا چاہیئے۔ اس نے اپنے آدمیوں کو بلایا اور ان سے سوراخ کے چاروں طرف زمین کھودنے کو کہا۔ کھودتے ہی ایک چشمہ ابلنے لگا جو خاصی مقدار میں پانی دے رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کے پانی کا مسئلہ حل ہوگیا۔ اس کے آدمیوں نے سوراخ کو کھود کر اتنا بڑا کردیا کہ وہ مویشیوں کے پانی پینے کے لیے تالاب کا کام کرسکے۔

وہ اپنے مویشیوں کو کھیت میں لایا اور اس تالاب میں پانی پینے کے لیے چھوڑ دیا۔ گائیں بے تابی سے پانی پینے گئیں لیکن ڈیکر یہ دیکھ کر بہت ہی مایوس ہوا کہ کسی گائے نے بھی وہ پانی نہیں پیا۔ اس اندازے کے تحت کہ پانی میں کسی عجیب چیز کی ملاوٹ ہے، اس نے پانی کو ایک کیمیائی ماہرِ کے پاس بھیجا تا کہ وہ اس کا کیمیائی ٹیسٹ کر سکے۔ اس نے رپورٹ دی کہ پانی میں پھٹکری ہے جس کا ذائقہ تیکھا ہوتا ہے۔ پھٹکری کا استعمال رنگنے اور زخموں، جھالوں، پھنسی پھوڑوں کو

دھونے میں ہوتا ہے۔اس لیے ڈیکر کو اس پانی کا ایک سودمند استعمال نظر آیا۔

1630 کی گرمیوں میں ایک اور خوشگوار حادثہ تب پیش آیا جب تالاب کے قریب کام کرر ہے مزدوروں کو بہت پیاس لگی۔تالاب میں پانی دیکھ کر وہ تالاب کا پانی پینے لگے حالانکہ وہ پانی کافی کڑوا تھا۔جلد ہی یہ پتہ چلا کہ پانی میں ایک دست آور اثر ہے۔اس لیے یقینی طور پر اس میں پھٹکری کے علاوہ بھی کوئی دوسری شے ہے۔اس پانی کا ایک بار اور کیمیائی ٹیسٹ کیا گیا جس سے پتہ چلا کہ پانی میں ایک اور شے ہے جسے آج میگنیشیم سلفیٹ کہتے ہیں۔

اس روایتی کہانی کا ایک اور رُخ ہے جو 1618 سے پہلے کی تاریخ ہمیں دکھلاتی ہے۔

ملکہ الزبتھ کے دورِ حکومت کے آخر میں کچھ لوگوں نے پایا کہ گاؤں سے تقریباً آدھا میل مغرب کی طرف کے تالاب کے پانی نے بہت سے دیہاتیوں کو شفا بخشی جو پیٹ کے پھوڑوں اور دوسری بیماریوں میں مبتلا تھے۔

جیمس اول کے دورِ حکومت میں کچھ ڈاکٹر اس پانی کی شہرت سن کر اپسم گئے۔انھوں نے پانی کے تجزیے Analysis سے یہ معلوم کیا کہ اس میں ایک تلخ، دست آور نمک ہے اور یہ رپورٹ کی کہ انگلینڈ میں یہ اپنے قسم کا واحد تالاب ہے۔ڈاکٹروں نے اس کی شہرت دور دور تک پھیلا دی۔نتیجہ کے طور پر لوگ بڑی تعداد میں پانی لینے کی غرض سے اپسم آنے لگے۔محکمہ انتظامیہ کے حاکم Lord of the Manor نے اس تالاب کے چاروں طرف ایک دیوار کھڑی کرانے کا ارادہ کیا اور مریضوں کے لیے ایک سایہ دار جگہ آرام گاہ کے طور پر بنوادی۔

سترہویں صدی میں لکھے گئے ایک واقعہ میں بیان کیا گیا ہے کہ بہت سے بڑے لوگ اپسم ایک ایسی دوا پینے گئے جو جنت سے آئی تھی۔ان میں سے ایک چارلس اول کی بیوی کی ماں میریا ڈی میڈیسی بھی تھی۔اس کی پیروی اسٹوارٹ کے عہد کے بہت سے معززین نے کی۔نیل گوئن نے وہاں ایک عیش گاہ بنوائی جہاں چارلس دوم اکثر آیا کرتا تھا۔

سترہویں صدی کے آخر میں اپسم فیشن کا مرکز بن گیا۔ ایک سترہ فٹ لمبی شاندار عمارت بنوائی گئی جس میں ایک بال روم یعنی ناچنے کا بڑا کمرہ بھی تھا۔ کھانے پینے اور شراب کی ایسی دکانیں کھل گئیں جو انگلینڈ میں سب سے بڑی مانی جاتی تھیں۔سڑکیں، پیدل اور پالکی بگھیوں میں سوار آدمیوں سے بھری ہوئی تھیں۔اس قصبہ نے اتنی شہرت اختیار کرلی کہ نئی نئی عمارات بننے کے باوجود وہاں آنے والے تمام لوگوں کو رہنے کی جگہ دینا ممکن نہیں تھا۔

پانی پینے کے بعد لوگوں کو بقیہ وقت گزارنے کے لیے بہت سے تفریح کے سامان تھے۔کنویں پر ہر صبح ایک بڑا عوامی ناشتہ ہوا کرتا تھا اور پھر اس کے بعد موسیقی کا پروگرام ہوتا تھا۔روزانہ دوپہر میں گھوڑوں کی دوڑ اور سہ پہر میں ڈنڈا پیٹنے، کشتی، مکہ بازی اور دوڑ کا مقابلہ ہوا کرتا تھا۔شامیں گھریلو دعوتوں، محفلوں اور تاش کے کھیل میں گزرتی تھیں۔

گھوڑ دوڑ ایک مقبول کھیل بن کر جاری رہا۔مشہور گھوڑ دوڑ ڈربی

Derby، 1780 میں پہلی بار شروع ہوئی او رایسی ہی مشہور گھوڑ دوڑ اوکس دوسرے سال شروع ہوئی۔ پہلی گھوڑ دوڑ کا نام لارڈ ڈربی سے وابستہ تھا اور دوسری گھوڑ دوڑ کا نام اس کے ایک شاندار مکان 'اوکس' Oaks کے نام پر تھا جو اپسم کے قریب تھا۔

بہت سے وہ لوگ بھی تھے جو اس قصبے میں آنے سے معذور تھے۔ ان کے لیے یہ انتظام کیا گیا تھا کہ پانی سے میگنیشیم سلفیٹ کے کرسٹل حاصل کر کے انھیں بھیجے جائیں۔ ان کی قیمت کافی زیادہ تھی۔ چمچہ بھر کرسٹل یا نمک کے دانوں کی قیمت تقریباً پانچ شیلنگ ہوا کرتی تھی۔

لیکن وقت کے ساتھ اس قصبے کی مقبولیت کم ہوتی گئی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس نمک کے کرسٹل ایسی چیزوں سے بنائے جانے لگے جو کبھی اپسم کے قرب وجوار میں نہیں پائی گئیں۔ یہ شے کئی سال تک ایک دوا کی شکل میں استعمال ہوتی رہی اور آج بھی اپسم نمک خاصی بڑی مقدار میں فروخت ہوتا ہے۔

اپسم سالٹ، جسے انگریزی نمک بھی کہتے ہیں، جلاّب کے طور پر اور مختلف دواؤں میں استعمال ہوتا ہے، اور اس کو میگنیشیم سلفیٹ سے تیار کرتے ہیں جس کا کیمیائی فارمولہ $MgSO_4 \cdot 7H_2O$ ہے اور یہ ہیپٹا ہائڈریٹ سلفیٹ منرل اپسو مائٹ heptahydrate sulfate mineral epsomite کہلاتا ہے۔ بعض لوگ غلطی سے اسے سیندھا نمک، یا کالا نمک سمجھ لیتے ہیں جو سندھ کے پہاڑوں سے نکلنے اور اپنے رنگ کی وجہ سے سیندھا نمک یا کالا نمک کہلاتا ہے۔

اس کی کچھ خوبیاں اپسم نمک سے ضرور ملتی ہیں لیکن اس کا بنیادی فارمولہ بالکل الگ NaCl (سوڈیم کلورائڈ) ہے جس میں سوڈیم سلفیٹ، آئرن سلفائڈ اور ہائڈروجن سلفائڈ بھی ملا ہوتا ہے۔ یہ نمک ہاضمے کا چورن یا چٹپٹی چیزیں بنانے میں استعمال ہوتا ہے لیکن اپسم نمک کو ان کاموں کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا۔ پھر اس کا رنگ بھی سفید یا بھورا ہوتا ہے۔

قصہ کتّے کے غار کا

کتّے کا یہ غار جسے اٹلی کے باشندے گروٹا ڈیل کین Grotta del Cane کہتے ہیں، نیپلز شہر کے قریب اگنانو جھیل کے کنارے پر واقع ہے۔ اس جھیل کا قطر تقریباً دو میل ہے اور یہ ایک آتش فشاں پہاڑ کے غار سے بنا ہے۔ اس غار کی بہت سی عجیب و غریب خصوصیات ہیں جس کی وجہ سے اس کا یہ نام پڑا، اور یہ ایک گھومنے کے قابل مقام کی حیثیت سے مشہو رہوا۔ درحقیقت یہ سینکڑوں سال پہلے بھی ایک قابلِ دید مقام رہا ہے اور اس کی خصوصیات کے بارے میں اٹھارویں صدی میں لکھا گیا ہے۔ اُس زمانے میں جس مادے کو آج ہم گیس کہتے ہیں، اسے دھواں اور ابخرات کہتے تھے۔

ایک سیاح کے بیان کے مطابق غار کے فرش سے ایک بہت ہی ہلکا گرم دھواں اٹھتا ہے جسے آنکھوں سے دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ کئی ٹکڑوں میں نہیں اٹھتا ہے بلکہ ایک مسلسل رو کی شکل میں اٹھتا ہے اور

غار کی نچلی سطح کو مکمل طور پر ڈھک لیتا ہے۔ یہ دھواں عام گیسوں سے مختلف ہوتا ہے کیونکہ یہ دھوئیں کی مانند اٹھ کر ہوا میں تحلیل نہیں ہوتا بلکہ اٹھ کر پھر لوٹ آتا ہے اور زمین سے تقریباً دس انچ کی اونچائی پر

قدیم پینٹنگ میں غار کا نگراں سیاح مرد و عورت کو ایک کتا بیہوش کر کے دکھاتے ہوئے

رہتا ہے۔ اس لیے اس غار میں کھڑے ہونے پر کسی جاندار کو کوئی پریشانی نہیں ہوتی بشرطیکہ وہ اپنا سر اس اونچائی سے اوپر رکھے۔

لیکن بہت سے بدقسمت جانوروں کو اس کا موقع نہیں مل سکا۔

''وہ آدمی جو ہم لوگوں کو غار دکھانے لے گیا وہ غار کا سرپرست بھی تھا۔ وہ آدمی ہماری سواریوں میں ایک کتے کو دیکھ کر اسے پکڑنے کی کوشش کرنے لگا تاکہ وہ حسب معمول اپنا تجربہ اس جانور پر کر کے دکھا سکے۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ میں نے اس کی حرکت کو پسند نہیں کیا وہ دوڑ کر اپنا کتا لینے چلا گیا۔ کتا لانے کے بعد وہ غار میں گھسا، پھر جھکا اور اپنی ایڑیوں پر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد اس نے کتے کی چاروں ٹانگیں پکڑیں اور اسے نیچے کی طرف جھکایا۔ یہ عمل اس نے کچھ دیر تک کیا۔ کتا فوراً ہی غرایا، پھر اس کا جسم لرزنے لگا اور اس کی آنکھیں گھومنے لگیں اور زبان باہر نکل آئی۔ اس کے اعصاب کھنچنے لگے اور اس کے بعد وہ بے ہوش ہوگیا۔ اس حالت میں جب کہ وہ موت سے لڑ رہا تھا اس کے مالک نے اسے بیس قدم دور جھیل اگنانو میں پھینک دیا۔ جھیل میں گرتے ہی اس کے حواس بحال ہوگئے اور وہ پانی سے نکل کر اس ڈر سے کہ اس پر پھر دوبارہ تجربہ نہ کیا جائے پوری تیزی سے بھاگ گیا۔ میں نے کتے کے مالک سے پوچھا کہ کیا جھیل کے پانی کی وجہ سے کتے کی جان بچی؟ کیونکہ وہ غار سے تقریباً مردہ حالت میں نکلا تھا۔ اس نے پورے یقین کے ساتھ جواب دیا کہ بے شک یہ صرف اس پانی کی وجہ سے ہوا۔ پورے یورپ کا یہی خیال ہے۔''

کبھی کبھی ان کتوں کے علاوہ دوسرے جانوروں پر بھی یہ عمل کیے جاتے تھے۔ مشہور برطانوی مصنف ایڈیسن نے اجگر سانپ کے ساتھ غار میں پیش آنے والے واقعے کا ذکر کیا ہے۔

''پہلی بار جب سانپ کو رکھا گیا تو وہ نو منٹ تک ہوش وحواس میں رہا اور دوسری بار دس منٹ تک۔ جب ہم پہلے تجربے کے بعد اس کو باہر لائے تو اس نے اپنے پھیپھڑوں میں اتنی زیادہ ہوا بھری کہ وہ پھول کر اپنی جسامت سے دوگنا ہوگیا اور شاید اسی وجہ سے دوبارہ تجربے

میں وہ سانپ ایک منٹ زیادہ ہوش وحواس میں رہا۔"

جب فرانس کے بادشاہ چارلس ہشتم نے 1494 میں نیپلز کو فتح کیا تو یہ غار بھی اس کے قبضے میں آ گیا۔ ایک دن اس نے ایک گدھے پر تجربہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ جانور کو غار میں لے جایا گیا اور اسے زبردستی فرش پر لٹا دیا گیا۔ تھوڑی دیر میں ہی اس کی بھی وہی کیفیت ہونے لگی جو کتوں کی ہوتی تھی اور وہ جلد ہی مر گیا۔

یہ غار کئی آدمیوں کے لیے موت کا مقام بھی بنا۔ کہا جاتا ہے کہ شہنشاہ ٹائبیریس نے دو غلاموں کو سزائے موت کے لیے اس غار میں بھیجا۔ انھیں غار کے اندر لے جایا گیا اور زنجیروں میں جکڑ کر فرش پر ڈال دیا گیا اور وہ فوراً ہی مر گئے۔ بعد کی یہ بھی اطلاع ہے کہ پیٹر آف ٹولیڈو نے جو نیپلز کا وائسرائے تھا، دو سزا یافتہ آدمیوں کو غار میں ڈال دیا اور دونوں مر گئے۔ سولھویں صدی کی جنگ میں گرفتار کیے گئے ایک ترک غلام کو نیپلز کے وائسرائے کی ہدایت کے مطابق صرف یہ دیکھنے کے لیے زبردستی فرش پر لٹا دیا گیا کہ وہ کتنی دیر تک زندہ رہتا ہے۔ آدمیوں نے اس کا سر ابخرات کے نیچے کر دیا اور کافی دیر تک اسی حالت میں پکڑے رہے۔ پھر اگرچہ اسے کئی بار جھیل میں ڈالا گیا مگر بدنصیب ترک ہوش میں نہ آ سکا۔

یہ اندازہ لگایا گیا کہ غار میں کتا تین منٹ میں مرجاتا ہے، بلّی چار منٹ میں، خرگوش 75 سیکنڈ میں اور اگر آدمی کو اس مہلک زمین میں ڈال دیا جائے تو وہ دس منٹ سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا۔

ماحول میں کاربن ڈائی آکسائڈ کا بڑھنا ہماری صحت کے لیے بے حد خطرناک ہے!

اٹھارویں صدی میں بنائی گئی ایک تصویر میں کچھ واقعات دکھائے گئے ہیں، جو اس باب میں بیان کیے گئے ہیں۔ پس منظر میں ایک آدمی کو دیکھا جاسکتا ہے جو جھیل میں ڈال کر کتے کو ہوش میں لا رہا ہے۔ ایک دوسرا کتا یا تو ہوش میں آنے کے بعد بھاگ رہا ہے یا غار میں جانے سے بچنے کے لیے بھاگ رہا ہے۔ گدھے کو زبردستی غار میں ڈھکیلا جا رہا ہے۔

ان کہانیوں سے اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ آدمی اور دوسرے جاندار اس ماحول میں زندہ نہیں رہ سکتے جس میں کاربن ڈائی اکسائڈ زیادہ مقدار میں ہو۔ غار کے اندر کی زمین کے قریب کی ہوا کے تجزیے سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں تقریباً 75 فی صد کاربن ڈائی آکسائڈ 6 سے 7 فی صد تک آکسیجن اور تقریباً 23 فی صد نائٹروجن ہے۔ عام ہوا میں ایک فی صد سے کم کاربن ڈائی آکسائڈ ہوتی ہے۔ تجربات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہوا میں اگر 25 فی صد زیادہ کاربن ڈائی اکسائڈ ہو تو موت ہوسکتی ہے اگر یہ گیس ہوا میں دس فیصد سے کم ہو تو زہریلی نہیں ہے مگر شرط یہ ہے کہ اس میں زیادہ دیر تک سانس نہ لیا جائے۔ یہ زمین کے اندر مسلسل کیمیاوی عمل کی وجہ سے بنتی ہے۔ اس کی ایک بڑی مقدار زمین کی سطح پر آتش فشاں پہاڑوں سے پہنچتی ہے۔ غار کا علاقہ آتش فشاں ہے اور وہاں زمین کے اندر سے ایک بڑی مقدار میں کاربن ڈائی آکسائڈ غار کے پتھریلے فرش کی درازوں کو چیرتی ہوئی نکلتی ہے۔

قومی اردو کونسل کی مطبوعہ کتاب 'سائنس کی کہانیاں' جلد اول، سے ماخوذ

انیس الحسن صدیقی

اوراب آرہی ہے: بلیٹ ٹرین

بلیٹ Bullet یعنی پستول سے نکلنے والی گولی!

بلیٹ ٹرین، یعنی گولی کی طرح چلنے والی ریل گاڑی!

ہماری حکومت نے ایسی ہی گاڑیاں ہندوستان میں بھی چلانے کا فیصلہ کیا ہے جس کے تحت پہلی ہندوستانی بلیٹ ٹرین ممبئی اور احمد آباد کے درمیان چلے گی!

ممبئی اور احمد آباد کے درمیان 520 کلومیٹر کا فاصلہ ہے جس کے بیچ میں سورت کا صنعتی شہر بھی آباد ہے۔ سورت دنیا بھر میں ہیرے جواہرات کے کاروبار کے لیے مشہور ہے۔ یہاں باہری ملکوں کے باشندے کافی تعداد میں آتے ہیں جن کی وجہ سے ہر سال سورت میں تقریباً 80,000 کروڑ روپے کا کاروبار ہوتا ہے۔

اس راستے پر سب سے تیز رفتار ریل گاڑی، بلیٹ ٹرین 350 کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چلے گی تو امید ہے یہ کاروبار تقریباً ایک لاکھ کروڑ روپے تک پہنچ سکتا ہے۔ ریلوں کا محکمہ 63 ہزار کروڑ روپے کے اس پراجیکٹ پر تیزی سے کام کر رہا ہے اور امید ہے جلد ہی اس سلسلے میں کچھ اور اچھی خبریں سننے میں آئیں گی۔

لیکن آیئے ذرا ایک نظر پہلے اپنی موجودہ تیز رفتار ریل گاڑیوں پر بھی ڈال لیں۔ ہماری بھوپال شتابدی (دورنتو) ریل گاڑی کی رفتار

1903 میں رفتار کا نیا ریکارڈ قائم کرنے والی جرمن ریل کار

110 کلومیٹر فی گھنٹہ سے زیادہ ہوچکی ہے۔ دہلی اور بھوپال کے درمیان تاج محل کا آگرہ، تاریخی شہر دہلی سے تقریباً دوسو کلومیٹر کے فاصلہ پر آباد ہے جہاں باہر کے ملکوں سے کافی تعداد میں سیاح تاج محل دیکھنے آتے ہیں۔ یہ فاصلہ دورنتو ریل گاڑی دو گھنٹوں میں طے کرتی ہے۔ اسی طرح کولکاتا اور دہلی کے درمیان چلنے والی دورنتو گاڑی کم وبیش راجدھانی ایکسپریس جتنے وقت میں ہی اپنا سفر مکمل کر لیتی ہے۔ حال ہی میں وزیرِ اعظم جناب نریندر مودی کی خاص ہدایت پر دورنتو کی رفتار بڑھانے کے لیے تجربات کیے جارہے ہیں اور جلد ہی اس ریل گاڑی کی رفتار 160 کلومیٹر فی گھنٹہ ہونے کی امید ہے۔ جس کے بعد دہلی اور آگرہ کے درمیان سفر صرف ڈیڑھ گھنٹہ کا رہ جائے گا۔

ہمارے لیے ٹرینوں کی یہ رفتار اچھی خاصی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ریل گاڑیوں کی رفتار کے سلسلہ میں ہمارا ملک ابھی بیسویں صدی میں ہی ہے جبکہ جاپان اور دوسرے ملکوں میں بُلیٹ ٹرین کے نام کی ریل گاڑیوں کی رفتار 510 کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار تک پہنچ چکی ہے جس کی وجہ سے وہاں کے لوگوں نے ہوائی جہاز میں سفر کم کردیا ہے۔

ایک سوال یہ ہے کہ دنیا میں بُلیٹ ٹرین کہاں کہاں کامیاب ہوسکی ہے؟ اکیسویں صدی کو دیکھیں تو اس میں بُلیٹ ٹرین سب سے تیز رفتار ریل گاڑی ثابت ہوئی ہے۔ 1899 میں جرمنی میں تیز رفتار ریل گاڑیوں کی نشوونما شروع کی گئی تھی جس میں بجلی کے ذریعہ ریل گاڑیوں کی رفتار 72 کلومیٹر فی گھنٹہ کی گئی تھی اور 1903 میں پہلی ریل کار 206.7 کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چلائی جاسکی تھی۔ جی ہاں، ریل کار ـــــ ریل گاڑی یا ٹرین نہیں!

1957 میں جاپان کے انجینئروں نے ٹوکیو اور ڈاکیو کے درمیان بجلی کی ریل گاڑی کی رفتار 145 کلومیٹر فی گھنٹہ رکھی تھی جو کہ ڈاکیو ایس ای ایم یو سیریز کے نام سے اسٹنڈرڈ پٹری پر چلنے والی سب تیز رفتار ٹرین کہلائی گئی۔ اس سے پہلے ٹوکیو اور ڈاکیو کے درمیان ریل گاڑی تنگ پٹری پر چلتی تھی۔

یکم اکتوبر 1964 میں پہلی بُلیٹ ٹرین جس کا نام 'شِن کاسین' تھا ٹوکیو اور اوساکا کے درمیان اولمپک گیمز کے لیے شروع کی گئی۔ اِس پہلی بلیٹ ٹرین کی زیادہ سے زیادہ رفتار 210 کلومیٹر فی گھنٹہ تھی اور اوسط رفتار 162 کلومیٹر فی گھنٹہ رہی۔

اس کے بعد فرانس میں ایس این سی ایف، ٹی جی وی، پی او ایس نامی ریل گاڑیوں کی رفتار 574.8 کلومیٹر فی گھنٹہ تک پہنچی۔ اِن ریل

جاپان کا فیوجی پہاڑ، چیری کے درخت اور ان کے بیچ دوڑتی ہوئی 'شن کاسین' Shinkasen بلیٹ ٹرین

گاڑیوں کے پہیوں کی یہ سب سے زیادہ رفتار تھی لیکن صرف اِس کی صلاحیت جانچنے کے لیے نہ کہ سفر کرنے کے لیے۔

2013 میں چین کا نشانہ تھا کہ ریل گاڑی کی رفتار ایک ہزار کلو میٹر فی گھنٹہ تک پہنچانے کا ریکارڈ قائم کیا جائے ۔یعنی آواز کی رفتار 1236 کلومیٹر فی گھنٹہ کے آس پاس چلنے والی سب سے تیز زمینی گاڑی ایجاد کی جائے۔ اس کے لیے بنائی گی شنگھائی میگلیو ٹرین میں بجلی کے مقناطیس کی تکنیک استعمال کی گئی، جس میں ٹرین اپنی پٹری سے چند انچ اوپر رہتی ہے اور اس کی الیکٹرک میگنیٹ کوائلز Electric Magnet Coils کو پٹری میں لگی ویسے ہی میگنیٹ کوائلز آگے دھکا دیتی ہیں۔ اس طرح یہ ٹرین پٹری پر نہیں چلتی بلکہ ہوا میں تیرتی ہے، اور چونکہ یہ فولادی پٹریوں سے رگڑ نہیں کھاتی اور friction کا عمل اس کی رفتار کے لیے رکاوٹ نہیں بنتا اس لیے کم انرجی سے ہی اس کی رفتار کو زیادہ سے زیادہ بڑھایا جاسکتا ہے۔ لیکن اس ٹرین کی رفتار 430 کلومیٹر فی گھنٹہ تک ہی پہنچ سکی۔ دوسری میگلیو ٹرین کی اوسط رفتار 251 کلومیٹر فی گھنٹہ پائی گئی ہے۔

1981 میں فرانس کی ٹی جی وی یعنی ترایاں گوں وی تیس Train à Grande Vitesse ٹرین سروس شروع ہوئی تھی۔ 2007 تک اس کے نیٹ ورک میں فرانس جرمنی اور سوئٹزرلینڈ شامل تھے۔

اسپین کی الٹرا ویلوسی ڈاڈا اسپانولہ (اے وی ای) ٹرین 310 کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی ہے۔ چین کے بعد اسپین میں دنیا کا سب سے بڑا 3100 کلومیٹر کا بُلیٹ ٹرین نیٹ ورک ہے۔ تائی وان میں 345 کلومیٹر کا نیٹ ورک اس کے مشرقی ساحل پر مکمل ہو چکا ہے۔ اس پراجیکٹ پر تقریباً 18 ملین امریکی ڈالر کا خرچ آیا ہے

اب ہم بُلیٹ ٹرین کی تکنیک پر نظر ڈالتے ہیں۔

سائنسی زبان میں یہ ٹرینیں میگلیو ٹرینز Maglev Trains کہلاتی ہیں۔ لفظ میگلیو، مقناطیس کے ذریعہ ہوا میں تیرنے کے عمل

magnetic levitation کا مخفف ہے جس کا مطلب ہے کہ یہ ریل گاڑیاں لوہے کے پہیہ اور پٹری کے پُرانے سسٹم کی بجائے ایک طرح کے کھانچے یا guideway پر مقناطیس کی بنیادی خصوصیتوں کا استعمال کرتے ہوئے ہوا میں تیرتی ہیں۔ مقناطیس کی دو بنیادی خوبیاں ہیں۔ کھینچنا اور دھکیلنا۔ یہ آپ جانتے ہی ہیں کہ میگنیٹ کے دو سرے یا پول Pole ہوتے ہیں ۔مقناطیسی حساب سے نارتھ North یا شمالی پول اور دوسرا South یا جنوبی پول۔ بجلی کے حساب سے یہ منفی Negative اور مثبت Positive پول کہے جائیں گے۔ پھر یہ بھی آپ کو معلوم ہوگا کہ مخالف مقناطیسی پول جس طاقت سے ایک دوسرے کو کھینچتے ہیں، ایک جیسے پول اتنی ہی طاقت سے ایک دوسرے کو دھکیلتے ہیں۔ بس یہ ہے وہ بنیادی اصول جس سے میگلیو بلیٹ ٹرین میں فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ ایک طرف ٹرین میں بجلی کے طاقتور میگنٹ لگے ہوتے اور دوسری طرف پٹری کے guideway میں بھی بجلی کے مقناطیسی حلقے یا کوائلز لگادیے جاتے ہیں۔ جب ان کوائلز میں بجلی دوڑتی ہے تو ایک جیسے مقناطیسی پول ایک دوسرے کو دھکیلنے لگتے ہیں اور ٹرین چل پڑتی ہے۔ پھر جیسے جیسے بجلی کی طاقت بڑھائی جاتی ہے ٹرین کی رفتار بڑھتی جاتی ہے۔ یہ بلیٹ ٹرینوں کی اس وقت کی سب سے مشہور تکنیک کا ایک آسان سا بیان ہے۔ آگے جب آپ بڑی کلاسوں میں جائیں گے اور انجینیئر نگ وغیرہ کی تعلیم حاصل کریں گے تب آپ ان تکنیکوں کے الجھاؤ کو آسانی سے سمجھ سکیں گے۔

اس وقت ایک طرف مختلف ملک میگلیو تکنیک میں نئے نئے سدھار لا رہے ہیں تو دوسری طرف نئی تکنیکوں پر بھی تجربے ہو رہے ہیں۔ وہ دن ہم بزرگوں کے لیے تو شاید کافی دور ہو لیکن آپ کے لیے بہت دور نہیں ہے جب ہندوستانی انجینیئر وں کی ذہانت کی بدولت صرف ممبئی اور احمد آباد کے تیز رفتار ٹریک پر ہی نہیں بلکہ ہمارے ملک کے دوسرے حصوں میں بھی جا بجا بلیٹ ٹرینیں عام لوگوں کو تیزی کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا رہی ہوں گی اور قوم آج کے مقابلے میں اور بھی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہوگی! □

مصنف انڈین بلیٹ ٹرین کا اپنا بنایا ہوا ماڈل مقناطیس سے چلاتے ہوئے

Anees ul Haq Siddiqui
679 Sector- 22B Gurgaon-122015

محمد اعجاز

بلیک باکس

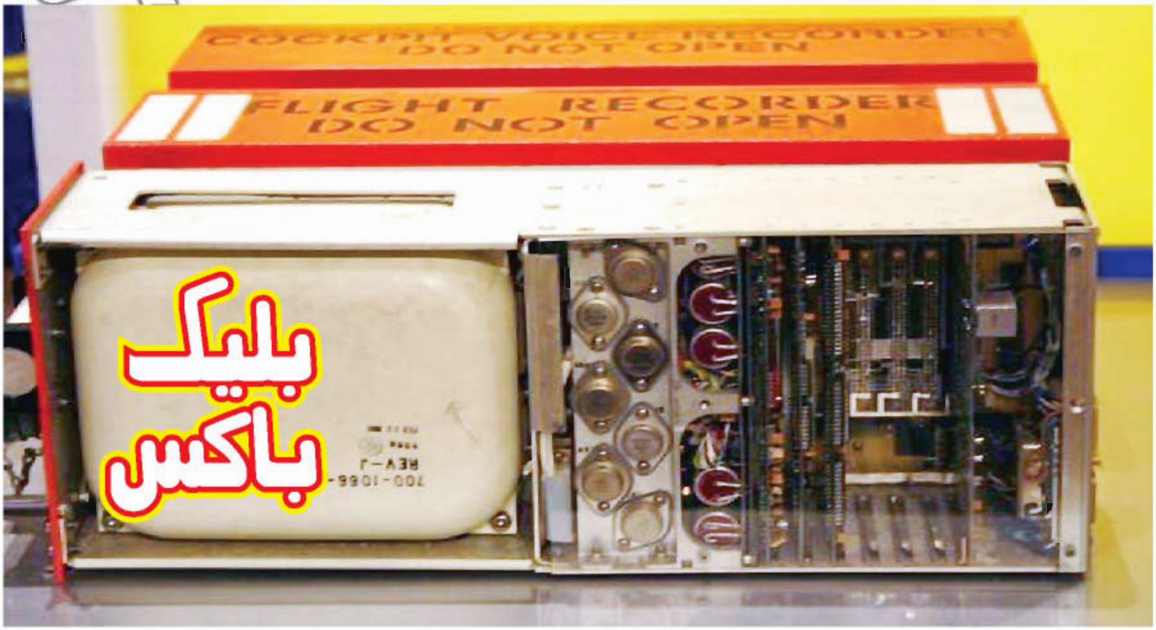

جب بھی کسی ہوائی جہاز کے حادثے کی خبر آپ سنتے ہیں تو اس کے ساتھ ایک بلیک باکس کی خبر ضرور رہتی ہے کہ یا تو وہ مل گیا ہے یا اس کی تلاش چل رہی ہے۔ آخر یہ بلیک باکس ہے کیا چیز جس کی ہر ہوائی حادثے کے بعد سب کو فکر رہتی ہے۔ اور پھر اسے بلیک باکس ہی کیوں کہتے ہیں؟ کیا یہ کالے رنگ کا ہوتا ہے؟ چلیے آج آپ کو اسی بارے میں بتاتے ہیں۔

دراصل کسی ہوائی جہاز کے حادثے کی وجہ کا پتہ لگانے میں دو آلوں یا مشینوں سے بہت مدد ملتی ہیں۔ ایک ہے ہوائی جہاز کا فلائٹ ڈاٹا ریکارڈر FDR اور دوسرا ہے کاک پٹ وائس ریکارڈر CVR۔ یہ دونوں آلے مل کر بلیک بکس کہلاتے ہیں۔ پہلے والے ریکارڈ یعنی FDR میں جہاز کی اڑان سے متعلق ڈاٹا، جیسے جہاز کی رفتار، اونچائی، سمت وغیرہ کا حادثے کے وقت تک کا ریکارڈر موجود رہتا ہے۔ دوسرے ریکارڈر یعنی کاک پٹ وائس ریکارڈر CVR میں، جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے کاک پٹ کے اندر ہونے والی باتیں اور دوسری آوازیں، بلکہ اب تو ویڈیو ریکارڈنگ بھی محفوظ رہتی ہیں۔ کاک پٹ Cockpet آپ جانتے ہی ہوں گے، وہ کیبن یا کمرہ ہوتا ہے جہاں جہاز کے پائلٹ بیٹھ کر جہاز کو کنٹرول کرتے ہیں۔

اب آپ سوچ رہے ہوں گے کہ نام کی طرح بلیک باکس کا رنگ بھی کالا ہوتا ہوگا لیکن ایسا نہیں ہے۔ یہ نارنجی رنگ Orange Color کا ہوتا ہے۔ اس پر آگ اور پانی کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ 20,000 فٹ کی دوری سے اس کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔ بلیک باکس کی بیٹری بڑی طاقت ور ہوتی ہے اور یہ 30 روز تک چلتی ہے۔ اس کی طاقت سے بلیک باکس خاص ریڈیو فریکوئینسیوں پر خاص طرح کے سگنل نشر کرتا رہتا ہے تا کہ ان کی مدد سے باکس کو ڈھونڈا جا سکے۔

بلیک باکس کو جہاز کے پچھلے حصے میں لگایا جاتا ہے، کیونکہ یہ حادثے کی صورت میں بھی سب سے زیادہ محفوظ رہنے والا حصہ مانا جاتا ہے۔ جہاز میں لگانے سے پہلے بلیک باکس کے کئی ٹسٹ ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر اسے گھنٹوں آگ میں رکھا جاتا ہے اور کافی اونچائی سے گرا کر بھی دیکھا جاتا ہے کہ اس میں کوئی خرابی تو نہیں آئی۔ ایک صحت مند بلیک باکس 1110 ڈگری سیلسیس کی حدت والی آگ

میں کئی گھنٹے اور 260 ڈگری سیلسیس کی گرمی میں 10 گھنٹے تک رہ سکتا ہے۔ یہ 55 سے 70 ڈگری سیلسیس درجہ حرارت میں بھی کام کرسکتا ہے۔ 1960 میں آسٹریلیا دنیا کا پہلا ایسا ملک تھا جس نے جہازوں میں بلیک باکس لگانا ضروری کردیا تھا۔ ہندوستان میں یہ یکم جنوری 2005 سے سبھی جہازوں اور ہیلی کاپٹروں کے لیے لازمی کیا گیا۔

جہاز کا بلیک باکس ملنے کے بعد جانچ کرنے والے اسے لیباریٹری میں لے جاتے ہیں، جہاں اس میں ریکارڈر ڈاٹا کے ذریعے جہاز کے حادثے کے شکار ہونے کے اسباب کا پتہ لگایا جاتا ہے۔

جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے، بلیک باکس میں ڈاٹا محفوظ رکھنے کی بے پناہ صلاحیت ہوتی ہے۔ یہ ہوائی جہاز کے حادثے سے 25 گھنٹے پہلے تک کے ڈاٹا کو محفوظ رکھتا ہے۔ یہ الگ الگ مائیکروفون پر گھنٹوں ہونے والی بات چیت کو ریکارڈ رکھتا ہے۔ بلیک باکس کے اندر ایک ULD یعنی Under water Locating Device لگی ہوتی ہے، جو پانی کے اندر کام کرتی رہتی ہے اور سمندر میں 14 ہزار فٹ نیچے سے بھی سگنل بھیج سکتی ہے۔ اس سے سمندر میں بلیک باکس کو ڈھونڈنا آسان ہوجاتا ہے۔

کل ملا کر دیکھیں تو بلیک باکس جہاز کے کاک پٹ کے اندر ہونے والی ہر بات چیت، ریڈیو سگنل، اڑان کی تفصیل جیسے رفتار، انجن کی حالت، ہوا کی رفتار، ہوائی جہاز کی اونچائی، راڈار Radar کی حالت اور مختلف ہوائی اڈوں کے کنٹرول روم سے ہونے والے رابطے، یہاں تک کہ آس پاس گزرنے والے جہازوں کے پائلٹوں کی گفتگو کو بھی ریکارڈ کرتا رہتا ہے۔

بلیک باکس سے متعلق ہی ایک آلہ ہے بلیوفن۔ Blue Fin 21 اگر جہاز سمندر میں حادثے کا شکار ہوجائے تو بلیک باکس کی کھوج کے لیے بلیوفن۔ 21 کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اسے انڈرواٹر ڈرون underwater drone بھی کہا جاتا ہے۔ یہ 400 میٹر کی گہرائی تک جاسکتا ہے۔

بلیک باکس کی ضرورت کس لیے اور کب محسوس کی گئی اس کی بھی ایک چھوٹی سی کہانی ہے۔ آسٹریلیا کے سائنس داں ڈیوڈ وارن David Warren نے 1950 کی دہائی میں بلیک باکس ایجاد کیا تھا۔ ان دنوں وہ ملبورن ایرونائٹیکل ریسرچ لیبارٹریز میں کام کرتے تھے۔ اس دوران جٹ انجن سے چلنے والا کمرشیل ایئرکرافٹ، کامیٹ، حادثے کا شکار ہوگیا تھا۔ وہ حادثے کی جانچ کرنے والی ٹیم میں شامل تھے۔ انہوں نے سوچا کیوں نہ کچھ ایسا بنایا جائے جو جہاز کے حادثے کا شکار ہونے سے کچھ وقت پہلے تک کی چیزوں کو ریکارڈ کرسکے۔ اس کے بعد انھوں نے فلائٹ ڈاٹا ریکارڈر پر کام کرنا شروع کیا اور یوں بلیک باکس وجود میں آیا۔ اس میں وقت کے ساتھ ساتھ کئی اضافے کیے گئے ہیں اور آج یہ پوری دنیا میں ہوائی جہازوں کی پرواز کی ایک اہم ضرورت اور لازمی شرط بن چکا ہے۔

ملیشیائی ائرلائنز کی فلائٹ 370 کے پراسرار حادثے کے بعد اس بحث نے زور پکڑ لیا ہے کہ کیوں نہ ہر ہوائی جہاز اور ہیلی کاپٹر کی اڑان کا مکمل ڈاٹا سیدھے سیٹیلائٹ نیٹ ورک پر محفوظ ہوتا رہے اور اس طرح بلیک باکس کی ضرورت اور جانچ کے کام کا سارا دارومدار بلیک باکس پر رہنے کی پریشانی سے نجات حاصل کرلی جائے۔ ن ظ

Mohd Aijaz
Raja Tola Harlakhi, Post Harlakhi
Waya Mali Gaon Kothi, Madhubani Bihar - 847240

حسن نظامی

دل کے آپریشن میں مہارت رکھنے والا

دنیا کا سب سے کامیاب سرجن

اس کی پیدائش 3 جولائی 1875 میں جرمنی کے شہر برمن Barmen مقام پر ہوئی تھی جب وہ دس برس کا ہوا تو اس کے والد کا انتقال ہوگیا، اس کی والدہ اس کی پرورش و پرواخت کرتی رہی۔ اس کی والدہ ایک جوتے کی دکان میں سیلز گرل کی حیثیت سے ملازمہ تھی۔ اس شخص کا نام تھا ارنسٹ فرڈینانڈ سار برخ Ernst Ferdinand Sauerbruch۔

سار برخ کو بچپن سے ہی ڈاکٹر بننے کا جنون تھا۔ لہٰذا اکیڈمک تعلیم مکمل کرنے کے بعد انھوں نے 1895 میں لیپزگ میڈیکل کالج میں داخلہ لیا۔ 1901 میں وہ سرجن کی ڈگری حاصل کر چکے تھے۔

اس زمانے میں دل کا آپریشن کرنا جوکھم بھرا کام تھا۔ ڈاکٹر سار برخ سے پہلے کے ڈاکٹروں نے یہ خطرناک کام کیا مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ سینہ چیرتے ہی ہوا اندر بھر جاتی تھی جس سے اندر ہوا کا دباؤ بڑھ جاتا تھا اور مریض مر جاتا تھا۔

1903 میں ڈاکٹر سار برخ بری سلو Breslau یونیورسٹی میں پروفیسر وون مائکولکز Von Mikulicz کے معاون بن گئے۔ بڑی محنت کے بعد ڈاکٹر سار برخ شیشے کا ایک ایسا چیمبر بنانے میں کامیاب ہو گئے، جس میں ہوا کا دباؤ گھٹایا جا سکتا تھا۔ سب سے پہلے انھوں نے ایک کتے پر تجربہ کیا جو کامیاب رہا۔ پھر انھوں نے ایک دن اپنے استاد پروفیسر وون مائکولکز کی موجودگی میں ایک انسان پر تجربہ کیا تو چیمبر فیل ہوگیا۔ اس سے پروفیسر وون بہت ناراض ہوئے اور ڈاکٹر سار برخ کو یونیورسٹی سے نکال دیا۔

اپنے پہلے تجربے کی ناکامی سے ڈاکٹر سار برخ مایوس نہیں ہوئے کچھ دنوں بعد انھوں نے پہلے کے مقابلے میں بڑا چیمبر تیار کیا۔ اس چیمبر میں کئی آپریشن کیے گئے جو سب کے سب کامیاب رہے۔ ڈاکٹر سار برخ کے اس کارنامے سے ساری دنیا حیران رہ گئی۔

ان دنوں سینے کا آپریشن کرنا بہت کٹھن کام سمجھا جاتا تھا۔ آپریشن

سے سینکڑوں باتوں پر سوچنا پڑتا تھا۔ مریض کو کہاں لٹانا ہے، کس کروٹ لٹانا ہے، آپریشن کہاں پر کرنا ہے۔ ڈاکٹر سار برخ نے ایک اور آپریشن چیمبر تیار کیا جو پہلے سے بھی زیادہ بہتر اور کارگر تھا۔ جو مریض کے ناکارہ پھیپھڑوں کو کاٹ کر نکال دیتا تھا۔ دن بہ دن ان کی شہرت بڑھنے لگی۔ دور دراز سے لوگ ان سے علاج کے لیے آنے لگے۔

ایک بار ایک طالب علم دانت کا علاج کرانے کے لیے آیا، ڈاکٹر سار برخ نے اس کا دانت نکال دیا، کیونکہ دانت بے کار ہو چکا تھا لیکن طالب علم فیس ادا نہیں کر سکا۔ اس کے پاس فیس ادا کرنے کے لیے پیسے نہیں تھے۔ وہ طالب علم 'لینن' تھے جو بعد میں روس کے رہنما بنے۔

کہتے ہیں کہ کسی سیاسی معاملے میں ڈاکٹر سار برخ کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا اور گولی مار دینے کا حکم سنایا گیا۔ ڈاکٹر سار برخ اپنے انجام سے بہت فکر مند تھے کہ اچانک ایک روسی طالب علم انھیں جیل سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ طالب علم 'لینن' تھا۔ ڈاکٹر سار برخ نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ''آج تک کسی مریض نے اتنی بڑی فیس ادا نہیں کی۔''

ڈاکٹر سار برخ کا تیار کردہ دل کے آپریشن کا ایک چیمبر

ڈاکٹر سار برخ غریبوں کا مفت علاج کرتے تھے۔ دوسری جنگ عظیم میں ڈاکٹر سار برخ نے بے شمار مریضوں کا علاج کیا۔ وہ جرمن ڈکٹیٹر ہٹلر کے خاص سرکاری معالج بھی تھے۔ لیکن جنگ کی تباہ کاریوں کو دیکھ کر وہ کانپ اٹھے۔ ان کا دل خون کے آنسو رونے لگا۔ انھوں نے تمام عہدوں سے استعفیٰ دے دیا۔ اس پر عدالت میں پھر حاضر ہونا پڑا۔ جج نے پوچھا کیا تم ایسے آدمی کا نام بتا سکتے ہو جو تمھاری طرف داری میں بولے۔

ڈاکٹر سار برخ نے کہا '' وہ لاکھوں مریض جن کی میں نے میدان جنگ میں خدمت کی ہے میری طرف سے گواہی دیں گے۔''

عدالت نے انھیں تمام الزامات سے بری کر دیا۔ لیکن دوسرے دن جج نے انھیں بلا کر جذباتی انداز میں کہا، ''اگر تمھیں سزا ہو جاتی تو میں استعفیٰ دے دیتا۔ تم واقعی گریٹ ہو اور ہمیشہ گریٹ رہو گے۔''

ڈاکٹر سار برخ کا 75 سال کی عمر میں 2 جولائی 1951 کو انتقال ہو گیا اور انھیں برلن میں دفن کیا گیا۔ □

Hasan Nizami
Road No. 17, H.No. 119, Green Valley
Post Azad Nagar, Jamshedpur-831012

سیر کر دنیا کی غافل

محمد زاہد

تھائی لینڈ

قدرتی حسن کا شاہکار

ہمارے وطن کے مشرقی ساحل سے تقریباً 2600 کلومیٹر کی دوری پر ملک تھائی لینڈ ہے جو خلیج بنگال سے قریب ہے۔ یہ ہمارے پڑوسی ملک میانمار یعنی برما کی سرحد کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ کبھی میانمار ہندوستان سے جڑا ہوا تھا۔ پرانے زمانے میں اسے سیام بھی کہتے تھے۔ اس کے شہر ینگون (رنگون) میں 1857 کی جنگ آزادی کے رہنما بہادر شاہ ظفر کا مزار ہے۔ تھائی لینڈ خشکی کے راستے سے ہندوستان سے جڑا ہوا ہے۔ ابھی صرف ہوائی جہاز کے ذریعہ وہاں جایا جاسکتا ہے لیکن مستقبل میں تیز رفتار ٹرین اور بسوں سے بھی وہاں پہنچا جاسکے گا۔ تھائی لینڈ کا رقبہ 513115 اسکوائر کلومیٹر ہے۔ اس کے قریب ترین ملک ویت نام، لاؤس، کمبوڈیا اور ملیشیا ہیں۔ آبادی ساڑھے چھ کروڑ ہے۔ بنکاک اس کی راجدھانی ہے۔ دوسرے مشہور شہروں میں پتے آ، پھوکیت، کربی، پی نانگ وغیرہ ہیں۔ یہاں کی کرنسی کو بھٹ Bhat کہتے ہیں۔ ایک بھٹ ہمارے یہاں کے دو روپے کے برابر ہوتا ہے۔ زیادہ تر لوگ بودھ مذہب کے ماننے والے ہیں۔ مسلمان یہاں صرف تین فیصد ہیں۔ یہاں ابھی تک بادشاہ حکومت کرتا ہے۔ بھٹ کرنسی پر گوتم بدھ اور بادشاہ کی تصویر بنی رہتی ہے۔ یہاں کے لوگ تھائی زبان میں بات کرتے ہیں۔ شہروں میں لوگ انگریزی بھی سمجھتے ہیں۔ اس لیے دور دراز سے آنے والے

تھائی لینڈ کا قومی پرچم اور کرنسی

سیاحوں کو یہاں زیادہ پریشانی نہیں ہوتی۔ اردو بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے لوگوں نے کھانے پینے کے ہوٹل کھول رکھے ہیں جہاں بڑے حرفوں میں ’حلال‘ لکھا رہتا ہے۔یعنی یہ کہ یہاں کھانوں میں صرف حلال گوشت استعمال ہوتا ہے ورنہ یہاں کے لوگ بہت کچھ کھا لیتے ہیں۔ کہیں کہیں اردو اور عربی میں لکھے ہوئے بورڈ بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔

بچو آپ نے تاریخ کی کتابوں میں پڑھا ہوگا کہ بدھ حکمرانوں خاص طور پر مہاراجہ اشوک نے بدھ مذہب کی تبلیغ کے لیے ہندوستان کے پڑوسی ملکوں میں بہت سارے لوگ بھیجے تھے۔ ان کی کوششوں سے چین، کوریا، جاپان، برما، ویت نام وغیرہ تک بدھ مذہب پھیل گیا، اور ساتھ ہی سنسکرت، پالی اور پراکرت زبانیں بھی دور دراز کے دیسوں تک پہونچیں۔ تھائی لینڈ کی اکثریت بدھ مذہب کو مانتی ہے۔لیکن ہندو مذہب کے اثرات بھی یہاں رہے ہیں۔ تھائی لینڈ کے ایک قدیم شہر کا نام ایوتھیا ہے جو دراصل سنسکرت لفظ ایودھیا سے بنا ہے۔ اس کی راجدھانی بنکاک کے ہوائی اڈہ کا نام ’سورن بھومی انٹرنیشنل ایرپورٹ‘ ہے۔سورن بھومی کا مطلب ہے سونے کی زمین۔ یہاں کی ایک بڑی سڑک کا نام راماروڈ Rama Road ہے جو رام چندرجی سے لوگوں کی انسیت کا پتہ دیتی ہے۔میٹرو ریل کے ایک اسٹیشن کا نام اشوک ہے۔ اندرا پوائنٹ کے نام سے ایک شاپنگ علاقہ بھی ہے۔

قدیم شہر ’ایوتھیا‘ میں تاریخی عبادت گاہیں

اگر تحقیق کی جائے تو تھائی زبان اور ہندوستانی زبانوں میں بہت سارے الفاظ ایک جیسے نظر آئیں گے۔

بنکاک اس ملک کی راجدھانی اور بہت بڑا شہر ہے۔ یہاں مشرقی اور مغربی تہذیب دونوں کا رنگ جھلکتا ہے۔ بدھ مذہب کے بڑے مندر ہیں ۔ کہیں کہیں مسجدیں بھی ہیں۔کہیں پر عظیم الشان ہوٹل اور چوڑی سڑکیں ہیں تو کہیں بستی کے طرز پر پرانے مکانات بھی ہیں۔ شراب خانے اور مساج پارلر عام ہیں۔ ہندوستانی کھانوں کے ہوٹل جگہ جگہ ہیں۔کلکتہ یا دہلی کی طرز کے کھانے ہر وقت کھانے کو مل جاتے ہیں۔ چپاتی، نان، بھنے ہوئے مرغ، بریانی، روزالہ، چکن چلی، اڈلی، ڈھوکلا وغیرہ سب دستیاب ہیں۔شاپنگ مال میں ہندوستان، پاکستان کے لوگوں کی دکانیں ہیں۔ جگہ جگہ بالی ووڈ کی فلموں کے گانے بجتے ہیں۔ ہندوستانی ٹی وی چینل چلتے ہیں۔ بنکاک میں دیکھنے کی جگہوں میں چڑیا گھر جسے Safari World کہا جاتا ہے،اور تیرتا بازار Floating Market اہم ہیں۔سفاری ورلڈ کا ٹکٹ 1200 بھٹ یعنی 2400 روپے میں ملتا ہے جس میں لنچ بھی شامل رہتا ہے۔

'پتایا' Pattaya جسے پتے آ بھی کہتے ہیں یہاں کا دوسرا مشہور شہر ہے۔ یہ بنکاک سے 200 کلومیٹر دور ہے اور ساحل سمندر کے کنارے واقع ہے۔ یہاں نیلا سمندر اور کھلا آسمان اور پانی سے گھرے جزیرے دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسپیڈ بوٹ سے سیاحوں کو سمندر اور جزیرے کی سیر کرائی جاتی ہے۔ یہاں راتیں جاگتی ہیں۔ رات کے ڈیڑھ دو بجے تک سیلانیوں کا جمگھٹ لگا رہتا ہے۔ تھائی لینڈ کی اسی خوبصورتی کی وجہ سے دنیا کے بیشتر ملکوں کے سیاح یہاں آتے ہیں خصوصاً ہندوپاک کے لوگوں کا خاصا مجمع دیکھنے کو ملتا ہے۔موقع ملے تو آپ بھی وہاں جائیں اور خود دیکھیں کہ تھائی لینڈ میں آج بھی ہندوستانی تہذیب کا کتنا اثر پایا جاتا ہے۔ □

Dr Mohd Zahid
B-5, Prince Dilaver Jah Lane Garden Rich, Kolkatta - 700024

پتایا شہر کے خوب صورت ساحل کا ایک منظر، اوپر سفاری ورلڈ کا ایک گوشہ

سِندبادِ جہازی

زمین! زمین! ہم بچ گئے۔ طوفان کا زور کم ہو رہا ہے...
نہیں! اللہ رحم کرے... لگتا ہے ہم بھٹک گئے ہیں
ہم اپنے راستے سے بہت دور نکل آئے ہیں۔ یہ خوف ناک درندوں کا پہاڑ ہے۔ آج تک کوئی اس جزیرے پر نہیں اترا اور جو اترا وہ وہاں کا حال بتانے کے لیے زندہ نہیں لوٹا!
لگتا ہے طوفان تھم گیا!
ہاں، تم ٹھیک کہتے تھے
رکو! اگر تم نے انھیں کچھ بھی نقصان پہنچایا تو یہ ہم سب کو مار ڈالیں گے
مگر یہ ہمارے ساتھ کیا کرنے جا رہے ہیں؟
پتہ نہیں۔ وہ ہمارے جہاز کو کنارے کی طرف گھسیٹ رہے ہیں
اوک! گوک! وکلے۔ گوگلے!
آہ! اب ہمارا خاتمہ نزدیک ہے!

بجائے اس کے کہ وہ ہمیں اتاریں
ہمیں خود ہی جہاز سے اتر جانا چاہیے!
ٹھیک ہے جو ہوگا دیکھا جائے گا، مگر خدا کی قسم اگر انھوں نے مجھے ہاتھ لگایا تو انھیں برا نتیجہ بھگتنا ہوگا
میرا خیال ہے اپنا ناچ پورا ہونے کے بعد یہ ہمیں مار ڈالیں گے
قسم سے، یہ تو پورے شیطان لگتے ہیں
ایسا خوف ناک منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا
او گلے، وو گلے الکو پلکو
اوہ! اوہ! اوہ!
ہو ہو ہا! ہا!! ہا!!
درندے جہاز لے کر بھاگے جا رہے ہیں
یہ بڑا شیطان، یا جو کچھ بھی یہ ہے، اس سے سب ڈر رہے ہیں!
ہائے! لگتا ہے اس منحوس جزیرے سے اب ہم کبھی نہیں نکل سکیں گے

دیکھو، دیکھو!
جو کچھ میرے پاس ہے جناب عالی وہ سب لے لو مگر مجھے چھوڑ دو۔ دولت، جائداد سب دے دوں گا... یقین کرو... خدا کی قسم کھاتا ہوں
ہو ہو! سب میں موٹے تم ہی ہو، رات کے کھانے کا مزا آجائے گا، کیا خیال ہے؟
اب تو علی میاں کا کام تمام ہی سمجھو!
تم نے سنا کچھ؟ کیا واقعی وہ اسے کھا جائے گا؟
ہمیں اس لعنتی جزیرے سے نکلنے کی کوئی تدبیر سوچنی چاہیے
کل اس دیو کو پھر بھوک لگے گی۔ اس کا مطلب ہے ہم میں سے ایک اور کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ اس سے بچنے کا کوئی راستہ ہونا ہی چاہیے
آخر رات ہوگئی۔ تھکے ہوئے سوداگر سونے لگے، تب سند باد پہرہ دینے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا
یہاں سے بھاگتے وقت یہ تیرنے والے تختے ہمارے کام آئیں گے
صبح ہوئی تو سند باد کو ایک ترکیب سوجھی
خدا خیر کرے... وہ دیو واپس آگیا ہے
بھاگو بھاگو، جان بچاؤ!!

با آ آوَو! یہ تو بالکل مریل سا ہے!
اف، میری پسلیاں..
اوہ!...وہ والا کافی موٹا تازہ ہے
لو، اب بدر بھی گیا...
اس دن کے لیے تم ہمیشہ روؤ گے..
ہمیں جلدی سے اپنی تخت ناؤ مکمل کر لینی چاہیے

تخت ناؤ تیار ہوگئی۔ سند باد اور باقی لوگ دیو کا غار ڈھونڈنے کے لیے پہاڑ کی طرف چل دیے۔ وہ لکڑی کا ایک طرف سے نوکیلا کھمبا کندھوں پر لے چلے
انھوں نے چکنی چٹانوں کے پہاڑ کی مشکل چڑھائی شروع کردی
شش! یہ شاید اسی درندے کا غار ہے۔ سنو، پیٹ بھر جانے کے بعد یہ وحشی کس طرح سو رہا ہے
ہمیں جلدی کرنی چاہیے۔ لکڑی کا بھالا ادھر لے آؤ
اب...مل کر زور لگانا ہے!
فی یا آ آؤو!

اووہ! کچھ دکھائی نہیں دیتا، میں اندھا ہو گیا ہوں...
جلدی کرو جلدی...اور جلدی
دیکھو...ایک اور درندہ آ گیا! اب ہم نہیں بھاگ سکتے
اللہ نے چاہا تو اب بھی ایک موقع ہے
دیوزاد درندے چٹانوں کے بڑے بڑے ٹکڑے تخت ناؤ پر بھاگتے ہوئے لوگوں کی طرف اچھالنے لگے

لگتا ہے ہم بہت ہی دور نکل آئے ہیں...ان درندوں کے ہاتھوں مرنا شاید بھوک مرنے سے اچھا ہوتا
کم سے کم ان کی جان تو ایک دم نکل گئی
ہمیں ہمّت سے کام لینا چاہیے۔ اللہ ضرور ہمیں دیکھ رہا ہوگا
ارے وہ دیکھو جہاز...مجھے ایک جہاز نظر آرہا ہے
نہیں...یہ نظر کا دھوکا ہے!
مگر یہ سچ مچ ایک بحری جہاز ہے
انھوں نے ہمیں دیکھ لیا...جہاز تیزی سے مڑ رہا ہے
میں کسے اپنی جان بچانے کے لیے شکریہ کہوں؟ کس کا جہاز ہے یہ؟
اس کا مالک سند باد جہازی ہے
لیکن سند باد جہازی تو میں ہی ہوں؟
یا اللہ! یہ تو واقعی آپ ہیں..میں اس داڑھی میں آپ کو نہیں پہچان سکا آقا!
اوہ...اب مجھے یاد آیا...یہ تم ہو، ابوالکفیر
جہاز کے صدر ملاح نے بتایا کہ سند باد پچھلے سفر میں بد قسمتی سے ایک جزیرے پر پیچھے چھوٹ گیا تھا۔ جہاز روانہ ہوا تو کسی کو بھی احساس نہ ہوا کہ آقا پیچھے رہ گئے ہیں۔ کچھ دیر بعد جب پتہ چلا تو تیز ہوائیں تب تک جہاز کو دور لے جا چکی تھیں اور ساحل کی طرف لوٹنا ناممکن ہو گیا تھا...

Sinbad The Sailor سے ماخوذ/ترجمہ: شبنم پروین

□ میراجی

جنگ کا انجام

بہو کہے یہ بڑھیا میری جان کی لاگو بن کے رہے گی
ساس کہے گز بھر کی زباں ہے اپنی منہ آئی ہی کہے گی

بہو کہے جب دیکھو جب ہی خواہی نہ خواہی بات بڑھانا
ساس پکارے میرے اللہ توبہ بھلی اب تو ہی بچانا

بہو کہے اپنا گھر کیسا یاں تو اپنے بھی ہیں پرائے
ساس کہے جل بھن کے اس کو راج محل بھی راس نہ آئے

بہو کہے جس کے ہاتھوں ہے ڈوئی اسی کا سب کوئی ہے
ساس کہے جاؤ جی جاؤ پاؤں کی جوتی سر پہ چڑھی ہے

بہو کے جو جی میں آتا تھا ساس کے سامنے بول رہی تھی
ساس بھی لیکن ترکی بہ ترکی بھید بہو کے کھول رہی تھی

نھنے نے یہ موقع تاڑا جھٹ باورچی خانے پہنچا
دودھ پہ آئی تھی جو ملائی چپکے سے اس کو کھانے پہنچا

کھا کے جو لوٹا راہ میں اس نے کالی بلّی جاتی پائی
دیکھ کے اس کو ڈر کے مارے زور سے اس نے چیخ لگائی

ایک ہی چیخ نے اس کی پل میں ساس بہو کا جھگڑا چکایا
دوڑی بہو ''مرے لال ہوا کیا'' ساس پکاری ''ہائے خدایا''

بچّو، میراجی اردو کے بڑے اچھے شاعر اورمشہورادیب تھے۔ اصل نام تھا محمد ثنااللّٰه ڈار، مگر میراجی کے نام سے شہرت پائی۔خوب پڑھے لکھے اورادب کے بڑے عالم ہونے پر بھی من موجی اور مست مولا قسم کے آدمی تھے۔کئی بارحلیہ بھی عجب سا بنائے رکھتے تھے۔ بڑی کلاسوں میں جب آپ ان کی شاعری پڑھیں گے تو ان کی ذہنی بلندی دیکھ کر حیران رہ جائیں گے۔ وہ25مئی 1912 کو گوجراں والا میں پیدا ہوئے تھے۔ صرف 37سال کی عمر میں 3نومبر 1949 کو ممبئی میں میرا جی کا انتقال ہوگیا! ن ظ

محمد زاہد

بھونچال آنٹی

ٹنّو! اپنی آنٹی کے ہاتھوں بہت پریشان تھا۔ اس کی پہلی پریشانی تو یہ تھی کہ آنٹی اسے اصلی نام کی بجائے ابھی تک بچپن کے نام سے پکارتی تھیں، جب کہ وہ اب بچہ نہیں رہا تھا۔ آٹھویں درجے میں پڑھتا تھا۔ اسکول میں اسے برج ٹنڈن ساہنی کہا جاتا تھا، لیکن گھر پہنچتے ہی آنٹی کے لیے وہ بس ٹنّو ہو کر رہ جاتا تھا۔ جب دیکھو ٹنّو! جہاں دیکھو ٹنّو، ہر وقت ٹنّو، ٹنّو، ٹنّو، ٹنّو کی پکار لگی رہتی تھی۔

اس نے آنٹی سے بیسیوں بار کہا تھا ''آنٹی مجھے ٹنّو نہ کہا کریں۔''

لیکن آنٹی نے اسے ہر بار ایک ہی جواب دیا تھا، ''میں تو تمہیں اسی نام سے پکاروں گی، چاہے جتنے بھی بڑے ہو جاؤ، میں نے ہی تمہارا یہ نام رکھا تھا، جب تم ایک ہاتھ جتنے تھے، سمجھے۔ ٹنّو نام مجھے بہت پیارا لگتا ہے۔ جتنے پیارے تم لگتے ہو۔''

یہ کہہ کر آنٹی ہمیشہ پیار سے دونوں ہاتھوں میں اس کا سر پکڑ لیتیں۔ چاہتیں کہ اس کے سر کو چوم لیں۔ لیکن ایسا کرنے میں وہ اس کے بڑی محنت سے سنوارے ہوئے بال بگاڑ دیتیں، اور ٹنّو جھنجھلا کر ان

رام لعل ، اردو کے بڑے مشہور افسانہ نگار تھے۔ ان کا پورا نام رام لعل چھابڑا تھا لیکن مشہور وہ رام لعل کے نام سے ہی ہوئے۔ 1923میں پنجاب کے شہر میاں والی میں ان کی پیدائش ہوئی تھی جو اب پاکستان میں ہے۔اپنی زندگی کا بڑا حصہ انھوں نے ریلوے کی ملازمت میں گزارا۔ اردو کے ہر رسالے میں ان کے افسانے چھپا کرتے تھے۔ انھوں نے بے شمار افسانے لکھے، سفر نامے بھی تحریر کیے اور روزانہ ڈائری بھی لکھا کرتے تھے جو بعد میں کتاب کی صورت میں چھپی۔ بچوں کے لیے انھوں نے بہت سی کہانیاں لکھیں اور یہ کہانی جو آپ یہاں پڑھ رہے ہیں عرصہ پہلے ماہنامہ 'کھلونا' میں چھپی تھی۔ مگر ہمیں تو بھئی یہ نانی کے صندوق سے ہی ملی ہے! ن ظ

کے ہاتھوں کی پکڑ سے دور بھاگ جاتا۔ جیب سے چھوٹی سی کنگھی نکال کر بالوں کو پھر سے سنوارتے ہوئے کہتا'' آنٹی مجھے جس نام سے چاہو پکارو، لیکن میرے بالوں کو نہ چھوا کرو۔''

یہ سن کر آنٹی اسے پکڑنے کے لیے اس کی طرف پھر سے آتیں، تا کہ اس کے سر پر ہاتھ رگڑ کر بال بالکل ہی خراب کر دیں۔ تو ٹمّو جلدی سے گھر سے ہی بھاگ نکلتا تھا۔

ٹمّو کی دوسری پریشانی یہ تھی کہ اس پر نظر پڑتے ہی آنٹی کو بہت سے کام یاد آجاتے تھے۔ وہ اسے نہ کبھی آرام سے رہنے دیتیں نہ چین سے کھیلنے کی مہلت بخشتیں۔ کسی نہ کسی کام کے لیے یہاں سے وہاں، وہاں سے یہاں دوڑاتی رہتی تھیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ آنٹی کے بہت سے کام تو انکل بھی کر سکتے تھے، اور وہ انھیں کرنے کے لیے آمادہ بھی رہتے تھے۔ لیکن آنٹی تو ان لوگوں میں سے تھیں جو اپنے شوہر کو بے حد بے وقوف سمجھتی تھیں، اور بچوں کو بے حد ذہین۔ ایک بات اور بھی تھی۔ آنٹی کے اپنے دو بچے یوگی اور کٹی بھی تھے جو کام سے کبھی جی نہیں چراتے تھے۔ لیکن آنٹی کو صرف ٹمّو سے کام لینا اچھا لگتا تھا۔

کبھی کبھی تو ٹمّو شکایت بھی کر بیٹھتا'' آنٹی تمہارے کاموں سے تنگ آ کر میں اپنے ڈیڈی کے پاس لوٹ جاؤں گا۔'' لیکن آنٹی چمک

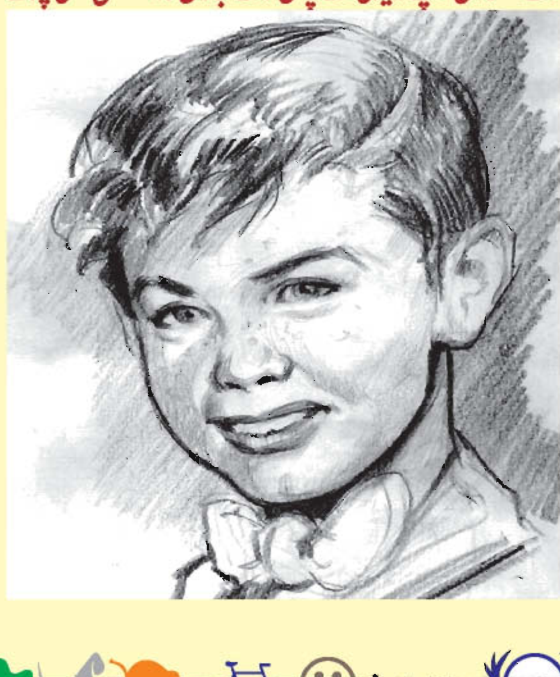

کر جواب دیتی'' تم سمجھتے ہو کہ میں وہاں نہیں پہنچ سکوں گی، تم سے کام لینے کے لیے میں ہر جگہ جا سکتی ہوں۔ کیونکہ تم ہی اتنے اچھے بچّے ہو کہ میرا ہر کام اچھی طرح کر دیتے ہو۔''

ٹمّو جانتا تھا کہ آنٹی یہ بات خوشامد کے طور پر کہا کرتی ہیں لیکن وہ آخر کار ہار مان لیتا۔ اس طرح کی خوشامد کبھی کبھی اسے اچھی بھی لگتی۔ پھر آنٹی کام کے بدلے میں ٹافیاں بھی تو دیا کرتی تھیں۔ ٹافیاں پا کر ٹمّو ساری شکایتیں بھول جاتا تھا۔

آنٹی کی وجہ سے پورا گھر شور سے گونجتا تھا۔ اسی کی وجہ سے ٹمّو کو گھر کی ہر چیز حرکت کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اسی لیے ایک روز ٹمّو کے دل میں اچانک یہ خیال پیدا ہوا کہ آنٹی کا نام کیوں نہ بھونچال آنٹی رکھ دیا جائے۔ وہ ہر ایک معاملے میں بھونچال ہی تو ہیں۔ صرف

باتوں اور عادتوں کی وجہ سے ہی نہیں، جسم کے رقبے کے لحاظ سے بھی وہ ویسی ہی ہے۔ ان کے قدم اٹھاتے ہی زمین کانپتی ہوئی سی لگتی ہے۔

ننھو نے دل ہی دل میں فیصلہ کرلیا کہ کسی مناسب موقع پر وہ آنٹی کے نئے نام کا اعلان کردے گا۔ یہ نیا نام یقیناً سب کو پسند آئے گا۔ سب انھیں بھونچال آنٹی کہنے لگیں گے۔ اس طرح وہ آنٹی سے ننھو کہنے کا بدلہ لے سکے گا۔ اگر آنٹی اس پر اعتراض کریں گی تو وہ بھی ان سے کہہ دے گا "مجھے تمہارا یہی نام اچھا لگتا ہے۔" جیسے وہ اس سے کہا کرتی ہیں۔ "تمھیں ننھو کہنا مجھے اچھا لگتا ہے۔"

آنٹی ہر سال اپنا جنم دن دھوم دھام سے منایا کرتی تھیں۔ ویسے وہ اپنے بچوں کا اور ننھو کا جنم دن بھی مناتی تھیں، لیکن ان کے اپنے جنم دن کی شان ہی اور ہوتی تھی۔ اس روز وہ اپنی کئی درجن سہیلیوں کو دعوت دیتیں۔ درجنوں قسموں کے کھانے کی چیزیں تیار کراتیں۔ اس دن تو بے چارہ ننھو کاموں کے سلسلے میں دوڑتے دوڑتے بے حال ہوجاتا تھا۔

اس بار سال گرہ کے موقع پر اس نے آنٹی سے کہا "اب کی دفعہ سال گرہ کا کیک میں آپ کو پیش کروں گا۔"

ننھو نے جو روپے جمع کر رکھے تھے ان کا وہ ایک بڑا کیک بنوالایا۔ کیک لے کر وہ اس وقت گھر میں آیا جب سب مہمان جمع ہوچکے تھے اور بڑی بے صبری سے کیک کے پہنچنے کا انتظار کررہے تھے۔

کیک کا بند ڈبہ میز پر رکھ دیا گیا آنٹی کی سہیلیاں اسے دیکھنے کے لیے میز کے گرد جمع ہوگئیں۔ ڈبا کھلا اور کیک دیکھتے ہی سب عورتیں حیرانی سے چیخ اٹھیں:

"...ہیپی برتھ ڈے...
...بھونچال آنٹی"

کیک پر لکھا دیکھ کر جیسے وہاں سچ مچ بھونچال آگیا۔ آنٹی نے اتنے غصے سے میز پر مکا مارا کہ میز گرتے گرتے بچی، اور اس کے ساتھ اس پر رکھا ہوا کیک بھی۔ مہمان عورتوں نے میز کو گرنے سے بچالیا اور وہ سب زور سے ہنس بھی پڑیں۔ ہنستے ہنستے مل کر "بھونچال آنٹی ہیپی برتھ ڈے ٹو یو" گایا اور آنٹی کو مبارک باد پیش کی۔

آنٹی کے لیے بھی اب ہنس پڑنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ننھو ابھی تک دروازے کے پیچھے چھپا کھڑا تھا۔ آنٹی کو ہنستا دیکھ کر وہ ڈرتے ڈرتے آنٹی کے پاس گیا اور بہت دھیرے سے کہا "ہیپی برتھ ڈے...... بھونچال آنٹی۔"

آنٹی نے اور دوسری عورتوں نے حیران ہوکر اس کی طرف دیکھا۔ مہمان عورتوں کے سامنے آنٹی کی ہمت نہ پڑی کہ وہ اس کو ڈانٹتیں۔ وہ بس مسکرادیں اور ننھو کے مونہہ میں کیک کا ایک ٹکڑا ٹھونس دیا۔ لیکن دوسرے ہاتھ سے انھوں نے ننھو کے خوب صورت بال بھی بگاڑ دیے۔

اس روز سے ننھو کی آنٹی کو سب لوگ بھونچال آنٹی ہی کہہ کر پکارتے ہیں، مگر وہ خوش مزاج آنٹی ہیں کہ برا ہی نہیں مانتیں۔ □

جاوید اکرم

ابّو کی دعا

قدم قدم پہ دعاؤں کے پھول کھلتے رہیں
سفر پہ نکلو تو منزل تمھارے ساتھ رہے
تمھارے پاؤں کہیں پر نہ ڈگمگائیں کبھی
تمھارے سر پہ تمھارے بڑوں کا ہاتھ رہے

تمھاری پلکوں پہ جلتے رہیں خوشی کے چراغ
تمھاری راہ کے سب کانٹے پھول ہوجائیں
تمھاری زندگی سورج کی طرح روشن ہو
تمھاری ساری دعائیں قبول ہوجائیں

خزاں کبھی نہ تمھاری بہار کو چھو پائے
تمھارے خوابوں کی کلیاں ہمیشہ کھلتی رہیں
تمھاری خواہشیں، جائز مرادیں پوری ہوں
تمھارے حق میں جو اچھی ہوں چیزیں ملتی رہیں

خدا کرے کہ زمیں ، آسماں کی خوشیاں ہوں
تمھاری مٹھی میں سارے جہاں کی خوشیاں ہوں
تمھارے نام سے روشن ہمارا نام بھی ہو
تمھاری صبحوں کے جیسی ہماری شام بھی ہو
غموں کے سائے کبھی ان کے آس پاس نہ ہوں
مرے خدا مرے بچے کبھی اداس نہ ہوں

Mr Javed Akram Kendriya Vidyalaya IIM,Prabandh Nagar, Lucknow-226013

قسط وار
داستان

پہلی قسط

اُلٹا دَرَخُت

کرشن چندر

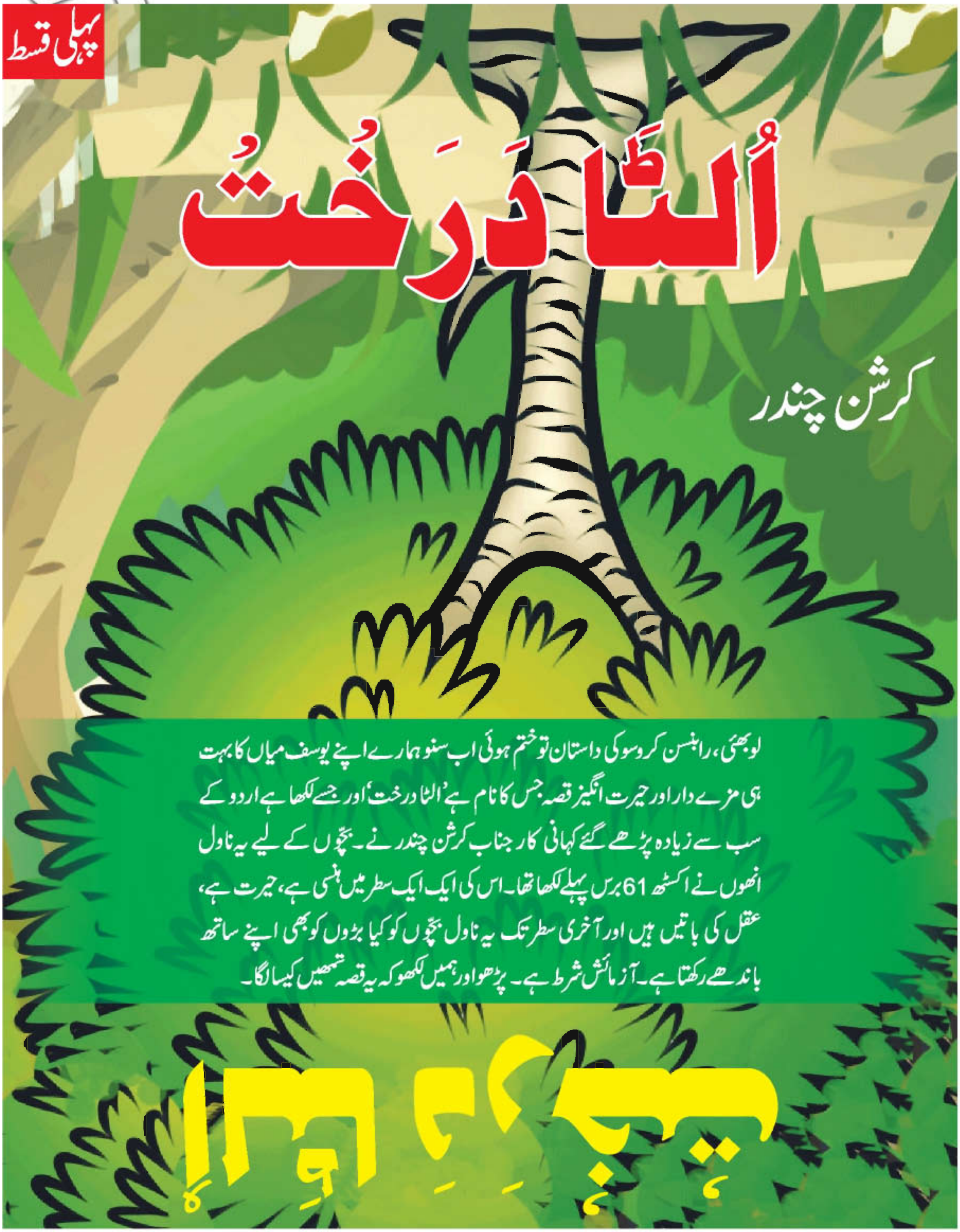

لو بھئی، رابنسن کروسو کی داستان تو ختم ہوئی اب سنو ہمارے اپنے یوسف میاں کا بہت ہی مزے دار اور حیرت انگیز قصہ جس کا نام ہے 'الٹا درخت' اور جسے لکھا ہے اردو کے سب سے زیادہ پڑھے گئے کہانی کار جناب کرشن چندر نے۔ بچّوں کے لیے یہ ناول انھوں نے اکسٹھ 61 برس پہلے لکھا تھا۔ اس کی ایک ایک سطر میں ہنسی ہے، حیرت ہے، عقل کی باتیں ہیں اور آخری سطر تک یہ ناول بچّوں کو کیا بڑوں کو بھی اپنے ساتھ باندھے رکھتا ہے۔ آزمائش شرط ہے۔ پڑھو اور ہمیں لکھو کہ یہ قصہ تمھیں کیسا لگا۔

جب یوسف کا باپ مرا تو یوسف کے پاس ایک جھونپڑا، ایک گائے، ایک کنواں اور ایک باغیچہ باقی رہ گیا تھا۔ باقی سب کچھ جو تھا وہ یوسف کا باپ اپنی زندگی ہی میں قرض کی بھینٹ چڑھا چکا تھا، کچھ گاؤں کے خوجے کو کچھ بادشاہ کو۔

باپ کے مرنے کے بعد یوسف کی ماں نے یوسف سے کہا ”اب ہمارے پاس کچھ نہیں رہا۔ اب تو سیدھا بادشاہ کے پاس چلا جا اور اس کی فوج میں بھرتی ہو جا۔“

یوسف بڑا بے وقوف اور منہ پھٹ تھا۔ وہ صرف بارہ برس کا تھا اور بات کرنے کی اسے تمیز نہ تھی۔ اس لیے اس نے ماں کی بات نہ مانی، الٹا کہنے لگا۔

”واہ میں کیوں بادشاہ کے پاس جاؤں؟ بادشاہ خود کیوں نہ میرے پاس آئے، فوج کی ضرورت اسے ہے، مجھے تو نہیں۔“

ماں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا بولی۔

”شش آہستہ بات کر، بادشاہ سن لے گا تو جان سے مار دے گا۔“

ایسا ہی ہوا۔ یہ بات بادشاہ کے کانوں تک پہنچ گئی، کیونکہ جو بادشاہ ظلم کرتا ہے وہ ملک میں مخبر بھی لگائے رکھتا ہے۔ جوں ہی اسے معلوم ہوا کہ یوسف نے کیا کہا۔ وہ خود یوسف کے پاس پہنچ گیا۔

یوسف نے پہلے اپنے بادشاہ کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے اس نے پوچھا۔

”تم کون ہو؟“

بادشاہ نے کہا ”میں با... با... با... بادشاہ س... س... س... سلامت ہوں۔“

یوسف نے ہنستے ہوئے کہا ”ارے تم تو ہکلے ہو؟ کیا سب بادشاہ ہکلے ہوتے ہیں؟“

بادشاہ کو بہت غصہ آیا۔ مگر اس وقت اسے فوجیوں کی ضرورت تھی۔ اس لیے غصہ کو پی گیا اور بولا۔

”نہیں ک... ک... کچھ ہکلے ہوتے ہیں، کچھ گ... گ... گنجے ہوتے ہیں، کچھ ب... ب... بہرے ہوتے ہیں۔ ہر ایک کو... کو... کوئی نہ کوئی بیماری ہوتی ہے۔“

”تمہیں کیا بیماری ہے؟“ یوسف نے پوچھا۔

”مجھے ظلم کرنے کی بیماری ہے۔“ بادشاہ نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

مگر میں کہاں تک اس کے ہکلے پن کو بیان کر سکتا ہوں۔

بادشاہ کا ہکلا پن بیان کرتے کرتے میرا قلم خود نہ ہکلا ہو جائے۔ اس لیے اب سیدھے سیدھے لکھتا ہوں تم سب جہاں کہیں بھی بادشاہ کی بات چیت آئے اسے خود ہکلا کے پڑھو۔ بڑا مزا آئے گا۔

یوسف نے کہا ”تو کیا مجھ پر بھی ظلم توڑنے آئے ہو؟“

بادشاہ نے کہا ”نہیں نہیں! اپنی فوج میں بھرتی کرنے آیا ہوں۔“

”تنخواہ کیا دو گے؟“

بادشاہ نے کہا ”میں اپنے فوجیوں کو تنخواہ نہیں دیتا۔ لوٹ میں سے چوتھا حصہ دیتا ہوں۔“

”لوٹ کیسی؟“

”میرے فوجی دوسرے ملکوں میں جاتے ہیں۔ لوٹ مار کرتے ہیں اور جو مال لاتے ہیں اس میں سے چوتھا حصہ ان کو دیتا ہوں۔ مگر تم کو دسواں حصہ دوں گا کیونکہ تم ابھی چھوٹے ہو۔ بارہ برس کے ہو۔ زیادہ لوٹ مار نہ کر سکو گے۔ جلدی بولو۔ تمہیں میری نوکری منظور ہے؟ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

یوسف نے سوچ کر پوچھا ”دوسرے ملکوں میں بھی آدمی رہتے

ہیں نا؟"

"ہاں بالکل تمہاری طرح کے آدمی رہتے ہیں۔"

یوسف نے کہا"تو پھر میں تمہاری نوکری نہیں کرسکتا؟"

بادشا نے اکڑ کر کہا "جانتے ہو تم بادشاہ سلامت سے بات کرر ہے ہو؟"

یوسف نے بھی اکڑ کر جواب دیا" جانتے ہو تم ایک موچی کے بیٹے سے بات کرر ہے ہو۔"

بادشاہ مسکرادیا۔ اس نے سمجھ لیا کہ لڑکا بے وقوف ہے۔ اب اس نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ اس نے جھونپڑے کے ارد گرد نگاہ ڈالی۔ خوب صورت باغیچے میں کھلے ہوئے حسین پھولوں کی طرف دیکھا اور بولا" تمہارے باغیچے کے پھول بہت خوبصورت ہیں۔"

یوسف اس تعریف سے بہت خوش ہوا۔ بولا"جتنے پھول چاہیں لے جاؤ۔"

بادشاہ نے کہا" جس زمین سے یہ پھول کھلتے ہیں وہ خود کتنی خوبصورت ہوگی۔ میں اس زمین کو کیوں نہ لے لوں۔"

یہ کہہ کر بادشاہ نے تالی بجائی۔ پچاس فوجی حاضر ہوگئے اور انہوں نے یوسف کا باغیچہ ضبط کرلیا۔ بحکمِ سرکار!

دوسرے دن ماں نے یوسف سے کہا۔

"اب تو باغیچہ بھی ہاتھ سے گیا۔ اب تو بادشاہ کی پلٹن میں بھرتی ہوجا۔"

یوسف نے کہا"ماں اگر میں بھرتی ہوگیا تو مجھے ظلم کرنے کی بیماری ہوجائے گی۔ ماں کیا تو چاہتی ہے تیرا بیٹا مرجائے؟"

ماں نے کانوں پر ہاتھ دھر کر کہا" توبہ توبہ بیٹا۔ میں تو دن رات تیری صحت کی دعائیں مانگتی ہوں۔"اتنا کہہ کر ماں جھونپڑے کے اندر چلی گئی۔ یوسف کنویں سے ڈول کھینچ کر اپنی گائے کو پانی پلانے لگا۔ اتنے میں اسے اپنے باغیچے میں، جو اَب بادشاہ کا ہوچکا تھا، ایک خوبصورت کپڑے پہنے ہوئے لڑکی نظر آئی۔

یوسف نے پوچھا"تم کون ہو؟"

لڑکی نے کہا"میں بادشاہ زادی ہوں۔ میں اپنے نئے باغیچے کی سیر کے لیے نکلی ہوں۔ مجھے جھک کر سلام کرو۔"

"کیوں سلام کرو؟"یوسف نے کہا۔

شہزادی نے اکڑ کر کہا "میں شہزادی ہوں۔"

یوسف نے اکڑ کر کہا" میں موچی کا بیٹا ہوں۔"

یوسف نے کہا"میرے کپڑے سونے کے تاروں کے بنے ہوئے ہیں۔"

یوسف نے کہا"میرے دانت بہت مضبوط ہیں۔"

شہزادی بولی"میں ہر روز گاجر کا حلوا کھاتی ہوں۔"

یوسف بولا" میں گاجر اگاتا ہوں۔ کیا تم گاجر اگاسکتی ہو؟"

شہزادی بولی"نہیں"

یوسف تلخی سے کہنے لگا" تم صرف حلوا کھاسکتی ہو۔ خیر کہو کیا کام ہے، کیوں آئی ہو؟"

شہزادی بولی"مجھے پیاس لگی ہے۔"

یوسف نے کنوئیں سے ڈول کھینچا اور شہزادی کو پانی پلایا۔

شہزادی نے پانی پی کر کہا" تمہارے کنویں کا پانی تو بہت میٹھا ہے۔ ایسا پانی تو میں نے زندگی میں کبھی نہیں پیا۔ اگر یہ پانی میٹھا ہے تو یہ کنواں کتنا میٹھا ہوگا جس سے یہ پانی نکلتا ہے۔ میں اس کنوئیں ہی

کو کیوں نہ لے لوں۔"

شہزادی نے تالی بجائی۔ پچاس فوجی حاضر ہوگئے اور انہوں نے کنوئیں کو ضبط کرلیا۔ وہی، بحکمِ سرکار!

تیسرے دن ماں نے پھر یوسف سے کہا "بیٹا اب تو فوج میں بھرتی ہوجاؤ ورنہ ہم بھوکے مرجائیں گے۔"

یوسف نے کہا "ماں ابھی تو یہ گائے باقی ہے۔ میں گاؤں کے خوجے کے پاس بیچ کر آتا ہوں، جو رقم ملے گی اس سے کچھ دن روٹی کھالیں گے پھر دیکھیں گے کیا ہوتا ہے۔"

ماں رونے لگی۔ گائے اسے بہت پیاری تھی۔ مگر بھوک کا کیا علاج۔ یوسف گائے کو کھول کر گاؤں کے خوجے کے پاس لے گیا خوجے نے پوچھا: "گائے کتنا دودھ دیتی ہے؟"

"تین سیر دیتی ہے، اچھا دودھ ہوتا ہے۔ پی کر دیکھ لو۔"

"پی چکا ہوں، جب تمہارا باپ زندہ تھا تب کی بات ہے گائے بہت اچھی ہے مگر دودھ کم دیتی ہے۔ تین سیر دودھ دیتی ہے اس لیے اس گائے کے تمھیں تین روپے ملیں گے۔"

"صرف تین روپے؟" یوسف نے حیران ہوکر پوچھا۔

"ہاں" خوجے نے کہا۔ "ایک سیر دودھ کا ایک روپیہ ہوتا ہے۔ اس حساب سے تین سیر کے تین روپے ہوئے۔ اگر تمہاری گائے چالیس سیر دودھ دیتی تو تم کو چالیس روپے ملتے۔ مگر میں کیا کروں تمہاری گائے تین ہی سیر دودھ دیتی ہے۔ یہ تین روپے لے جاؤ، حساب بالکل ٹھیک ہے۔"

یوسف بے چارے کو حساب کہاں آتا تھا۔ بولا "چاچا اس سے تو میرے گھر کا کام نہیں چلے گا۔"

خوجے نے کہا "تو یہ تین دانے لے جاؤ۔"

"یہ تین دانے کیسے ہیں؟"

"جادو کے ہیں۔ ایک جادوگر کو میرا قرضہ دینا تھا۔ وہ دے گیا تھا۔ ان تین دانوں کو جو کوئی زمین میں بوئے گا۔ اس کی زمین میں دوسرے ہی دن ایک جادو کا پیڑ نکلے گا جو آسمان تک پہنچ جائے گا پھر تم اس درخت پر چڑھ کے آسمان تک جاسکتے ہو۔ مگر شرط یہ ہے کہ ان تینوں جادو کے دانوں کو اکٹھا بونا ہے۔"

یوسف حیرت سے خوجے کی باتیں سنتا رہا۔ آخر میں خوجے نے کہا "تو بولو کیا لیتے ہوں، یہ تین روپے یا یہ تین دانے؟"

یوسف نے جلدی سے تین دانوں کو اپنی مٹھی میں دبایا، اور اپنے گھر کی طرف بھاگا۔ خوجہ بھاگتے ہوئے یوسف کو دیکھ کر مسکرایا، بولا:

"خوب الو بنایا گدھے کو۔"

یوسف بھاگتے ہوئے گھر...... پہنچا تو ماں نے کہا:

"روپے لائے۔"

یوسف نے کہا "میں تو جادو کے دانے لایا ہوں۔"

ماں نے ماتھا پیٹ لیا۔ بولی "ساری عمر بچے ہی رہوگے۔ یا کبھی عقل کی بات بھی کرو گے؟ ارے ان دانوں کا کیا ہوگا؟ روپے لائے ہوتے تو کچھ دو چار روز روٹی تو کھاتے۔ کیسا بے وقوف ہے میرا بیٹا۔"

یوسف نے کہا "یہ تین دانے جادو کے ہیں۔ انہیں باہر باغیچے میں بوؤں گا۔ تو ان میں سے ایک جادو کا پیڑ نکلے گا جو آسمان تک جائے گا۔ پھر اس پیڑ پر چڑھ کر آسمان تک جاؤں گا۔"

ماں نے کہا "آسمان پر جا کر کیا کروگے؟"

بیٹے نے کہا'' تمہارے لیے آسمان کے تارے توڑ کر لاؤں گا۔''

ماں نے سر ہلا کر کہا'' کیسے کیسے سپنے دیکھتا ہے میرا بیٹا، اس کو خوجے نے ٹھگ لیا۔ جاتی ہوں پڑوسی کے گھر سے کچھ مانگ کر لاتی ہوں۔''

جب ماں چلی گئی تو یوسف نے مٹھی کھولی اور دانوں کو باہر باغیچے کی گھاس پر رکھ کر ایک جگہ زمین کھودنے لگا تاکہ ان دانوں کو بودے۔ اتنے میں ایک کوا کائیں کائیں کرتا ہوا آیا اور دو دانے اٹھا کے لے گیا۔ یوسف بہت پریشان ہوا کیونکہ خوجے نے کہا تھا کہ تینوں دانے اکٹھے بونا ورنہ جادو کا اثر نہیں ہوگا۔ یوسف غم کے مارے رونے لگا۔ گائے بھی گئی، روپے بھی گئے اور آخر میں جادو کے دانے بھی گئے۔ اب اس کے پاس صرف ایک دانہ رہ گیا تھا۔ اب وہ کیا کرے؟ آخر اس نے سوچا، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ جادو کا پیڑ نہ سہی، کوئی پودا تو اگے گا۔ یہ سوچ کر اس نے اس دانے کو باغیچے کی نرم بھربھری زمین میں بودیا۔ اور جھونپڑے میں جاکے آرام سے سو گیا۔

رات کو بادل بہت زور سے گرجا اور بجلی بھی لہرا لہرا کوندتی تھی۔ بارش طوفان اور ہوا کے جھکڑ نے رات بھر یوسف کو سونے نہ دیا۔ رات کو کئی بار اٹھ کے بجلی کی روشنی میں باغیچے کی طرف دیکھا۔ مگر اسے کہیں جادو کا پیڑ نظر نہ آیا۔ جب صبح ہوئی اور طوفان تھما تو یوسف بھاگ کر باغیچے میں گیا۔ طوفان نے باغیچے کے بہت سے پودے اکھاڑ دیے تھے۔ بہت سے پیڑ گر گئے تھے اور جہاں اس نے جادو کا دانہ بویا تھا، وہاں زمین بجلی گرنے سے پھٹ گئی تھی اور زمین میں ایک گہرا گڈھا نظر آ رہا تھا۔ مگر جادو کا درخت جو آسمان کی طرف اونچا جانا تھا، وہاں کہیں نہیں تھا۔

یوسف بہت مایوس ہوا۔ اس کی ماں بھی رونے لگی۔ اتنے میں یوسف نے جو غور سے زمین کے اندر گڈھے کی طرف دیکھا تو نظر آیا کہ اس کے اندر ایک بہت بڑا پیڑ اگا ہے۔ مگر الٹا اگا ہے۔ یعنی درخت آسمان کی طرف جانے کے بجائے نیچے زمین کے اندر ہی اندر، جہاں تک یوسف کی نظر گئی چلا گیا تھا۔ کئی میل نیچے جاکے یہ درخت اندھیرے میں گم ہو جاتا تھا۔

ماں نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا'' افسوس درخت الٹا اگ آیا۔ جانا تھا اوپر آسمان کو، چلا گیا نیچے زمین کے اندر۔ یہ سب اس خوجے کی کارستانی ہے۔''

یوسف زمین کے شگاف میں اتر گیا۔ اس نے درخت کے تنے کے گرد اپنی باہیں لپیٹ لیں، اور ماں سے کہنے لگا،'' الٹا اُگا ہے یا سیدھا میں تو اب اس درخت پر چڑھ کے دیکھتا ہوں کہ یہ کہاں جاتا ہے؟''

ماں منت کرتے ہوئے بولی'' ارے بیٹا زمین کے اندر مت جاؤ۔ اندر بہت اندھیرا ہے۔ جانے کیا ہے، کیا نہیں ہے۔ مجھے تو آگے اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔''

مگر یوسف نے اس کی ایک بات نہ سنی، وہ جلدی سے درخت کے تنے پر چڑھتا ہوا زمین میں اتر گیا۔ کچھ دور تو سورج کی روشنی اس کے ساتھ رہی اور وہ اس کی مدد سے درخت کی ٹہنیوں پر چڑھتا رہا۔ مگر آگے جاکے روشنی کا آنا بند ہو گیا اور وہ تاریکی میں درخت کی شاخوں کو ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھنے لگا۔

کچھ دور آگے جاکر اتنا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا کہ اسے بالکل کچھ نظر نہ آیا۔ یہاں پر اس کے کانوں میں طرح طرح کی آوازیں آنے لگیں۔'' مارو... مارو، جانے نہ پائے، بغاوت کردو...

آگ لگادو... لیٹروں کو لوٹ لو۔"

یوسف بہت گھبرا گیا۔ اس نے ہاتھ سے ٹٹولا۔ اسے درخت کے پاس ایک سیڑھی ملی۔ یوسف نے درخت چھوڑ دیا اور سیڑھی پر چڑھنے لگا۔ سیڑھی پر چڑھ کر وہ ایک دروازے پر پہنچا۔ دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھل گیا اور اس نے دیکھا کہ وہ ایک بہت بڑے گنبد کے نیچے کھڑا ہے۔ چاروں طرف لوہے کی سلاخیں ہیں، اور ایک طاقچہ میں ایک موم بتی جل رہی ہے۔ گنبد میں کوئی نہیں ہے۔ پھر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہزاروں آوازیں ایک دوسرے سے لڑ رہی ہیں۔

"کون ہے۔" یوسف گنبد کے نیچے کھڑا ہو کے چلایا۔

"کون ہے؟ کون ہے؟"

یوسف کی آواز گنبد ہی میں گونجی اور پھر جواب میں ہزاروں قہقہے سنائی دیئے۔ یوسف کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مگر وہ ہمت ہارنے والا نہ تھا۔ اس نے چلا کر کہا "جو ہنستا ہے وہ سامنے آجائے۔"
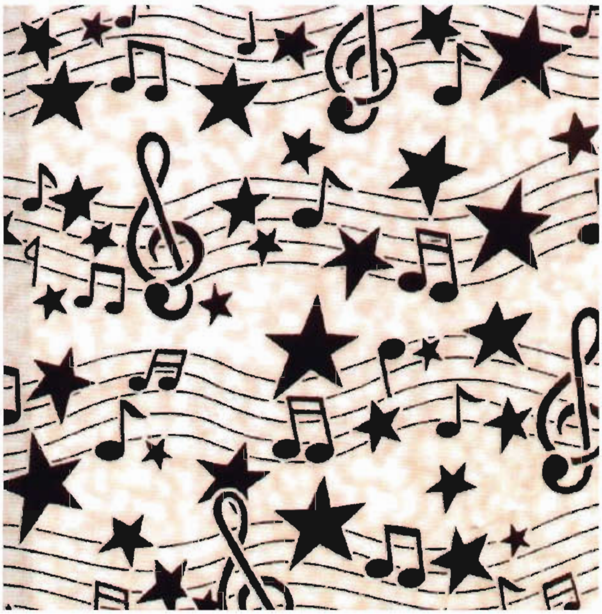
جواب میں پھر زور سے قہقہے لگے اور نعروں کی اونچی اونچی آوازیں سنائی دیں۔ جیسے ہزاروں لاکھوں لوگ ایک ساتھ چل رہے ہوں۔ ابھی یہ آوازیں اس کے کان میں آ ہی رہی تھیں کہ اس کے بالکل قریب ہی سے گویا ایک آواز سرگوشی میں آئی۔ اس آواز نے کہا "جانتے ہو تم کہاں ہو؟"

"نہیں" یوسف نے سر ہلا کر کہا۔

"یہ آوازوں کا قبرستان ہے۔"

"آوازوں کا؟"

"ہاں" ننھی منی سرگوشی کرنے والی آواز نے کہا۔ "یہ سب آوازیں ان آدمیوں، شاعروں، سیاست دانوں کی ہیں جن کو ہمارے بادشاہ نے یا تو قتل کرا دیا ہے یا جیل میں ڈال دیا ہے کیونکہ وہ اس کے ظلم کے خلاف آواز اٹھاتے تھے۔"

"پھر؟" یوسف نے پوچھا "پھر یہ ہوا کہ قتل کرنے کے بعد بھی اور جیل میں ڈال دینے کے بعد بھی ان شاعروں اور ادیبوں اور سیاست دانوں کی آواز نہیں رکی اور ملک میں گونجتی رہی اس لیے بادشاہ نے ہم تمام آوازوں کو بھی پکڑ لیا ہے، اور اس گنبد میں بند کر دیا ہے۔ اب اس کا خیال ہے کہ یہ آوازیں ہمیشہ کے لیے دبا دی گئی ہیں اور اب اس کو ہم سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ہا... ہا... ہا... بادشاہ کس قدر بے وقوف ہے۔"

یوسف نے پوچھا "کیوں؟"

"کیوں کہ ہم تمام آوازوں نے مل کر اس گنبد کے اندر ایک سرنگ تیار کی ہے۔ تم جانتے ہو یہ سرنگ بادشاہ کے محل تک جاتی ہے۔ یہ گنبد، یہ آوازوں کا قبرستان، بالکل بادشاہ کے محل کے نیچے واقع ہے۔ اب ہم سب آوازیں مل کر اس سرنگ میں ایک فتیلے (فلیتہ) کی طرح گھس جائیں گی اور تمہارا کام یہ ہوگا کہ اس موم بتی سے اس فتیلے کو آگ لگا دو۔ کیونکہ ہم صرف آوازیں ہی ہیں، ہمارے ہاتھ نہیں ہیں اور جب تک انسان کے ہاتھ اس کام میں نہیں لگیں گے، یہ فتیلہ نہیں چلے گا۔ تو اب جلدی سے تم یہ کام کر ڈالو اور پھر بھاگ کر اپنے درخت پر چڑھ جانا اور وہاں سے سب تماشہ دیکھنا۔"

یوسف نے طاقچے سے موم بتی اٹھا کر سرنگ میں رکھ دی۔ گنبد میں لاکھوں آوازیں گرجنے لگیں اور بارود کی تیزی سے سرنگ کے اندر

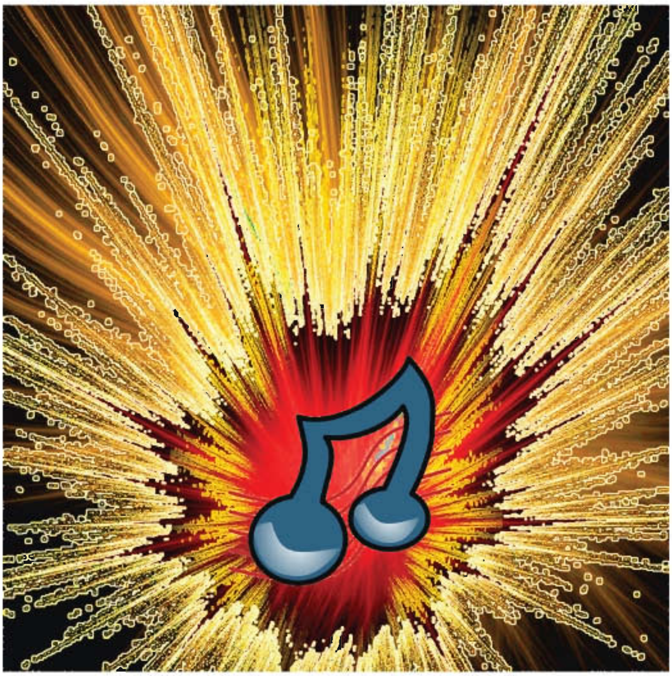

گھستی چلی گئیں۔ یوسف بھاگ کر دروازے سے باہر نکل گیا اور جلدی سے درخت پر چڑھ گیا۔ ابھی درخت کی ایک ٹہنی پر چڑھا ہی تھا کہ ایک زور کے دھماکے کی آواز آئی، جیسے آوازوں کا گنبد پھٹ گیا ہو... اور پھر اس نے دیکھا کہ درخت سے دور تک اور بہت دور تک ہزاروں موم بتیاں جل رہی ہیں اور بہت بہت دور تک اس کا راستہ روشن ہو گیا ہے۔

یوسف خوشی خوشی درخت کے اوپر چڑھتا گیا۔ تین دن اور تین رات درخت کے اوپر چڑھتا گیا۔ راستے میں اگر اسے بھوک لگتی تو پیڑ سے جادو کے دانے توڑ کر کھاتا جن کا ذائقہ انگور کی طرح میٹھا، اور انگور ہی کی طرح ان میں رس بھی تھا۔ جادو کے تھے نا وہ۔ اسی لیے۔

خیر تین دن اور تین راتیں اوپر چڑھنے کے بعد پھر اندھیرا چھا گیا۔ موم بتیاں ختم ہو گئیں۔ اب پھر وہ تاریکی میں اوپر چڑھتا گیا مگر تاریکی بڑھتی گئی۔ اس نے سوچا وہ کیا کرے، وہ آگے بڑھے یا پیچھے لوٹ جائے۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کسی نے ایک جھٹکے سے اسے درخت سے اتار لیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے کوئی اسے اپنی مٹھی میں دبائے ہوئے ہوا میں اڑ رہا ہے۔ یوسف نے اس کے پنجے سے نکلنے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ تھوڑی دور اس طرح ہوا میں اڑنے کے بعد کسی نے اسے ایک بہت بلند اور بڑے دروازے پر اتار دیا۔ یہ دروازہ اتنا بڑا تھا کہ ایک دیو بھی اس کے نیچے سے آسانی سے نکل سکتا تھا۔ یوسف تو خیر آدمی تھا۔ بڑی آسانی سے اندر چلا گیا۔ دروازے کی محراب پر لکھا تھا:

کالے دیو کا شہر!

جاری

فردوس گیاوی

بارش اک انعام!

امڈ گھمڈ کر بادل آئے
دور دور سے بارش لائے
رم جھم رم جھم پانی برسے
کبھی کبھی طوفانی پرسے
کھیتوں میں ہریالی آئی
چہروں پر خوش حالی چھائی
پہن کے وہ برساتی آیا
نانی سنگ میں ناتی آیا
موسم دل کو لبھاتا آیا
سب کے ہاتھ میں چھاتا آیا
کاغذی ناؤ چلائیں بچّے
بھیگ کے بھی اترائیں بچّے
وہ دیکھو پھر بجلی چمکی
بلّی نے پھر کھائی پلٹی
بڑے شور سے بادل گرجا
بڑے زور سے پانی برسا
نالے اور تالاب بھرے ہیں
ندیوں میں گرداب بھرے ہیں
اچھلیں کودیں گائیں بچّے
بارش میں چلّائیں بچّے

غضب کا یہ آساڑھ کا منظر
دیکھو بچّو باڑھ کا منظر
ہر بستی گیلی گیلی ہے
ساون گیت کی دھوم مچی ہے
دیکھ کے یہ ساون کے جھولے
راہی گھر کا رستہ بھولے
ساون جادو کردیتا ہے
کھیت اناج سے بھر دیتا ہے
قدرت کا اکرام ہے بچّو
بارش اک انعام ہے بچّو

Firdaus Gayavi Arif Nagar, Gewal Bigha, Gaya-823001 Bihar

ادارہ

یہ مزے مزے کی حکائتیں...

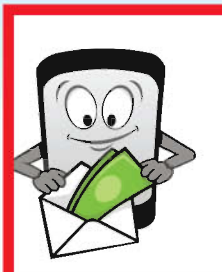

• ایک شیر کی شادی میں چوہا بھی گیا اور خوشی سے ناچنے لگا۔ یہ دیکھ کر شیر نے پوچھا، ''شادی میری ہے، تم کس لیے ناچ رہے ہو بھئی؟''

چوہے نے کہا، ''بات یہ ہے کہ شادی سے پہلے میں بھی شیر تھا، ہاہاہاہا!''

ثنا خان، راؤرکیلا، اڑیسہ

• امیتابھ بچن: بھائی آج میرے پاس پھلجھڑی ہے، چکری ہے، راکٹ ہے، ستلی بم ہے، تمھارے پاس کیا ہے؟

ششی کپور: میرے پاس ما... چس ہے!

• پاگل: ڈاکٹر صاحب میں خود کو خدا سمجھنے لگا ہوں؟

ڈاکٹر: یہ پرابلم کب سے ہے؟

پاگل: جب سے میں نے یہ دنیا بنائی ہے!

ندا آفریں، انجان گاؤں سورجی ضلع امراؤتی

• آپ کا رسالہ بہت خوب صورت ہے، بہت ہی اچھا ہے۔ بس یہی کہنا تھا اور کچھ نہیں۔

زویا میمن

• ایک بچہ دوسرے سے: میرے ابّو بہت ڈرتے ہیں

دوسرا بچہ: تم نے کیسے جانا؟

پہلا بچہ: ہمیں جب بھی سڑک پار کرنی ہوتی ہے وہ جھٹ میری انگلی پکڑ لیتے ہیں

ریحان

• آہٹ سی کوئی آئے تو لگتا ہے کہ تم ہو
سایہ کوئی لہرائے تو لگتا ہے کہ تم ہو
سچ سچ بتاؤ۔ کیا تم واقعی بھوت ہو؟

مصباح تبسم، مالیگاؤں

• بیوی شوہر سے: میں سمجھتی ہوں اب آپ کو اپنا علاج کسی جانوروں کے ڈاکٹر سے کرانا چاہیے

شوہر: کیا بکتی ہو؟

بیوی: دیکھیے نا، روز صبح آپ مرغے کی طرح اٹھ جاتے ہیں، گدھے کی طرح بھاگ کر آفس جاتے ہیں اور اسی کی طرح دن بھر کام کرتے ہیں، بندر کی طرح باس کے اشاروں پر ناچتے ہیں، گھر آ کر ہر ایک پر کتّے کی طرح چلّاتے ہیں، ہاتھی کی طرح کھاتے ہیں اور بھینس کی طرح گھوڑے بیچ کر سو جاتے ہیں...

سیف الاسلام، نیوج، اعظم گڈھ

• شوہر، فون پر: بیگم آج رات کھانے میں کیا بنے گا؟

بیگم، غصّے سے: زہر!

شوہر: ٹھیک ہے۔ تم کھا کر سو جانا، مجھے ذرا دیر ہو جائے گی

کامران، ناندیڑ، مہاراشٹر

• 'بچّوں کی دنیا' اب ہماری زندگی کا اہم حصہ بن گیا ہے۔ جناب خواجہ اکرام الدین اور نصرت ظہیر کے ہر لفظ سے محبت جھلکتی ہے۔ شکریہ!

سمرین شیخ، مالیگاؤں، مہاراشٹر

• استاد: قدرت نے پیٹ کس لیے بنایا ہے؟

شاگرد: جناب پتلون باندھنے کے لیے!

محمد اقدان انصاری، نظام پورہ، بھیونڈی

• ٹی وی رپورٹر زخمی سے: جب بم گرا تو کیا وہ زور سے پھٹا تھا؟
زخمی: جی نہیں۔ وہ رینگتا ہوا آیا اور شرما کر بولا، 'گستاخی معاف، کیا میں پھٹ سکتا ہوں؟'

شبانہ، مالیگاؤں

• دوزخ میں گناہوں کے ایگزام چل رہے تھے۔ سب لوگ پیپر میں اپنے اپنے گناہ لکھ رہے تھے۔ مزا تب آیا جب آپ کی آواز آئی: سپلیمنٹری پلیز!

صبا خان، تاج نگر، امراوتی

• عادل شعیب سے: تو کس روز پیدا ہوا تھا؟
شعیب: اتوار کو
شعیب: چل جھوٹے، اتوار کو تو چھٹی ہوتی ہے!

عاطف فراز، شاہی نگر، سلوڈ، اورنگ آباد

اس کے آگے میسیج میں عاطف میاں نے معصومیت سے جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھ کر ہمیں بھی ہنسی آگئی۔ لکھتے ہیں، ''انکل جی، پہلے میں نے ایس ایم ایس بھیجا تھا، آپ کو نہیں ملا کیا؟ خیر دوبارہ بھیج رہا ہوں۔ اب تو پسند کرلیں پلیز، پلیز۔ انکل پلیز!''

• اے پی جے عبدالکلام نے کہا ہے: ایک کتاب 100 دوستوں کے

برابر ہے، اور ایک اچھا دوست ایک لائبریری کے برابر ہوتا ہے

محمد اکرم، درجہ 7 اولاد حسین اسلامک اکادمی کولکاتا

• ایک پہلوان نے ایک آدمی کو زور سے تھپّڑ مار دیا۔
آدمی بولا، ''یہ تھپّڑ تم نے مذاق میں مارا یا غصّے میں؟''
پہلوان نے کہا، ''غصّے میں''
آدمی نے کہا، ''پھر ٹھیک ہے، کیونکہ مذاق مجھے بالکل پسند نہیں۔''

محمد حشام صدیقی، سہارنپور، یوپی

• مدیر اعلیٰ صاحب، 'بچّوں کی دنیا کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔ اتنا شاندار اور جاذب نظر رسالہ کوئی اور نہیں ہے۔ اس کے صفحات اور قیمت بڑھادیں۔

• انسان کا پیٹ اس کا کھلا دشمن ہے۔ عربی کہاوت
جسم کی راحت طعام کی کمی میں ہے۔ فارسی کہاوت
چھتیس بھوجن بہتّر روگ۔ ہندی کہاوت
یہ نہ سمجھ تو کھانے کے لیے بنا ہے، بلکہ زندہ رہنے کے لیے کھایا کر۔ اردو کہاوت
زیادہ کھانے والا اپنے دانتوں سے اپنی قبر کھودتا ہے۔ فرانسیسی کہاوت
بھرا ہوا پیٹ نصیحت نہیں سنتا۔ روسی کہاوت
کھانا خوب بنا تھا مگر پیٹ تو اپنا تھا۔ افغان کہاوت

• سقراط ایک معمولی خاندان سے تھا۔ ایک مرتبہ اس سے کسی نے کہا، ''تو پست خاندان سے ہے۔'' سقراط نے صبر و تحمل سے کام لیتے ہوئے کہا، ''میں اپنے خاندان میں شرافت کی بنیاد رکھ رہا ہوں اور تو اپنے خاندان میں ذلّت کی بنیاد رکھ رہا ہے۔''

محمد شاہد، صفہ لائبریری، کھیری باغ، مئو، یوپی

• اس دعا کو 33 بار زور زور سے پڑھنے سے آپ کے پیسے میں برکت

ہوگی۔ آپ کے پاس ہمیشہ پیسہ رہے گا۔ دعا ہے:
اللہ کے نام پہ دے دے...

صائمہ فردوس زاہد، مومن پورہ، ناگپور

• گبّر: یہ ہاتھ مجھے دے دے ٹھاکر!

ٹھاکر: لے لے میرے ہاتھ لے لے۔ جے اور ویرو کے بھی لے لے۔ بسنتی کے بھی لے لے۔ اور سانبھا کے بھی لے لے۔ اور بن جا ایک آکٹوپس Octopus!

گبّر: سوری یار، تُو تو اموشنل emotional ہوگیا!

مزمل صدیقی، مدرسہ عثمان بن عفان، اورنگ آباد

• موسم گرما کی پہلی رم جھم، ٹھنڈی ہوا، بھیگی بھیگی فضا، 'بچّوں کی دنیا' کے اسٹاف اور یہ رسالہ پڑھنے والوں کو بہت مبارک ہو!

• ڈاکٹر، سنتا سے: روز 5 کلومیٹر پیدل چلو، ایک سال میں 50 کلو وزن کم ہو جائے گا۔

ایک سال بعد

سنتا، ڈاکٹر سے فون پر: وزن تو کم ہو گیا ڈاکٹر صاحب، مگر اب گھر کیسے پہنچوں۔ 1825 کلومیٹر دور آ گیا ہوں!

• فلم دیکھنی ہے؟ تو چلو دیکھو۔ فلم کا نام ہے 'کورا کاغذ':

....

....

انٹرول Intervel

....

.... کہو کیسی لگی؟

ذوافشاں وحید، بیڈ، مہاراشٹر

• ایک لڑکے نے اپنے دوست سے کہا: میرا نام احسان ہے اور میں شاعر بننا چاہتا ہوں۔ یہ بتاؤ تخلص کیا رکھوں؟

دوست نے رائے دی: فراموش کے علاوہ جو لفظ بھی تمھیں پسند ہو اسے تخلص بنالو؟

لڑکے نے پوچھا: یہ احتیاط کس لیے؟

دوست نے کہا: اس لیے کہ لوگ تمھیں احسان فراموش کہنے لگیں گے!

خالد محمود، مالیگاؤں

• ایک عورت تیزی سے دوڑ کر چلتی ٹرین میں چڑھ گئی۔ لوگوں نے بڑی تعریف کی۔ کہا، کمال کی عورت ہے! یہ سنتے ہی عورت تیزی سے پلٹی اور بولی، کمال تو میرا دیور ہے۔ میں جمال کی عورت ہوں!

ہاجرہ شبنم، ناندیڑ

• تین لڑکے ایک ساتھ نماز پڑھ رہے تھے۔ ایک لڑکا ان کے سامنے سے گزر گیا۔ پہلا لڑکا بولا، ''او بے وقوف، نمازی کے سامنے سے نہیں جاتے۔'' دوسرے لڑکے نے کہا، ''نماز میں بات نہیں کرتے پاگل!'' یہ سن کر تیسرا بولا، ''خدا کا شکر ہے میں چپ رہا۔''

فیضان خاں، باسمتھ، مہاراشٹر

• سنتا عدالت میں جج سے: بچپن میں اگر ماں کی بات سنی ہوتی تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔

جج: کیا کہتی تھی ماں؟

سنتا: آپ بھی کیا جاہلوں والی بات کرتے ہیں جج صاحب۔ جب میں نے بات ہی نہیں سنی تو کیسے بتاؤں کیا کہتی تھی؟

• سنتا، بنتا سے: ارے یار یہ موبائل تو مجھے کنگال کر دے گا

بنتا: کیوں

سنتا: بار بار دکھاتا ہے بیٹری لو Battery Low۔ اب تک پچاس بیٹریاں لے کر بدل چکا ہوں!

نام، پتہ نہیں لکھا

• ایک اسپتال میں ہر پیر کی صبح 11 بجے کے بعد بیڈ نمبر 15 پر جو بھی نازک حالت کا مریض ہوتا اس کی موت ہو جاتی۔ جب مستقل ایسا ہونے لگا تو اس بیڈ کو منحوس اور آسیب زدہ قرار دے دیا گیا۔ نئے

آنے والے میڈیکل سپرنٹنڈنٹ کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو اس نے بیڈ کا بھید سمجھنے کی کوشش کی۔ پیر کی صبح 11 بجے سے پہلے ایک مریض کو بیڈ پر لٹادیا گیا۔ چاروں طرف کئی خفیہ کیمرے لگے تھے۔ مانیٹرنگ روم میں ڈاکٹروں کے علاوہ ماہرنفسیات، مولانا حضرات، اور سائنس دانوں کی ٹیم بھی موجود تھی تاکہ سبھی مل کر جان سکیں کہ مریضوں کی موت کا سبب کیا ہوتا ہے؟ آخر کار 11 بجے وارڈ کا دروازہ کھلا اور...

ایک صفائی کرنے والا اندر داخل ہوا۔ آتے ہی اس نے بیڈ نمبر 15 کی آکسیجن مشین کا پلگ نکال کر اپنا موبائل فون چارجنگ پر لگا دیا اور اطمینان سے صفائی کرنے لگا!

عاقب انصاری، نیا بازار، کامٹی، ناگپور

• بیٹا: پاپا ایک گلاس پانی دے دیجیے!

پاپا: خود لے لو نا! ہر کام دوسروں سے کراتے ہو۔ اب اگر پانا مانگا تو تھپڑ ماردوں گا!

بیٹا: چلیے، جب تھپڑ مارنے آئیں تو ایک گلاس پانی لیتے آئیں!

معاذ عبداللہ، اسلام آباد، مالیگاؤں

• ٹیچر: اسکول دیر سے کیوں آئے؟

اسٹوڈنٹ: راستے میں بورڈ پر لکھا تھا، آہستہ چلیے، آگے اسکول ہے!

ناصرہ فردوس، اسلام آباد، مالیگاؤں

• باپ: میں سوچ رہا تھا تمھیں کان کا ڈاکٹر بناؤں یا دانتوں کا؟

بیٹا: ابّو آپ مجھے دانتوں کا ڈاکٹر بنائیے، کیونکہ کان صرف دو ہوتے ہیں اور دانت پورے 32

کے طفیل

• ایک دوست: اگر میں اس پہاڑ پر چڑھ جاؤں تو مجھے کیا دوگے؟

دوسرا دوست: دھکّا!

خالد احمد مجاور اردو ہائی اسکول خان پور بیل گام کرناٹک

• پرچے میں وہ حساب آجائے
جس کا مجھ کو جواب آجائے
سادہ کاپی پہ بھی ملیں نمبر
اک نیا انقلاب آجائے
اب نہ چھوٹے غلیل ہاتھوں سے
یہی کارِ ثواب آجائے
ہم پہ کرتے ہیں ظلم جو ٹیچر
ان پہ بھی کچھ عتاب آجائے
گاؤں جس وقت بھی یہ اپنی غزل
ہاتھ حلوے کی قاب آجائے

محمد ذاکر، ٹونڈا پور، مہاراشٹر

• ایک شرابی سڑک پر کھڑا جھوم رہا تھا۔ پولیس والے نے یہ دیکھ کر کہا، ''ادھر کیوں کھڑا ہے۔ چل اپنے گھر جا!''

شرابی بولا، ''ابھی تو دنیا میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہی ہے صاحب۔ جیسے ہی میرا گھر سامنے آئے گا اس میں چلا جاؤں گا!''

محمد توفیق چودھری، پی ڈیگلور ناکا، ناندیڑ

• چلے تو تھے دوستوں کا پورا قافلہ لے کر، مگر
کچھ جدا ہو گئے
کچھ خدا ہو گئے
کچھ گم شدہ ہو گئے
کچھ شادی شدہ ہو گئے!

جمشید فردوسی

• ایک شخص نے جو اونچا سنتا تھا ایک دکان پر گلاس کی قیمت پوچھی۔ اتفاق سے وہ دکاندار بھی اونچا سنتا تھا۔ اس نے کہا: لے لو، گلاس پانچ روپے کا ہے!

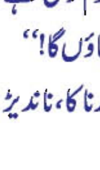

گاہک بولا: میں نے کب کہا یہ کانچ کا نہیں ہے!

دکاندار نے چلّا کر کہا: تین کا نہیں پانچ کا ہے

گاہک سمجھ کر بولا: وہ تو میں جانتا ہوں یہ ٹین کا نہیں کانچ کا ہے۔

دکاندار چیخا: نہیں نہیں، کانچ کا ہے ٹین کا نہیں...

زوریہ فردوس، اردو پرائمری اسکول، اورنگ آباد

ادارہ

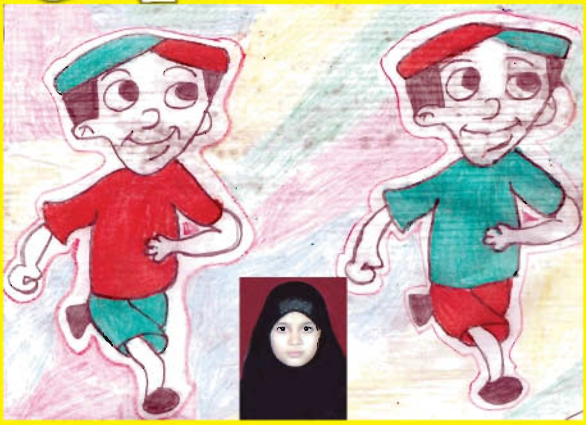

ڈرائنگ: عربینہ ناز، درجہ 6 ہاتھری ضلع پربھنی مہاراشٹر

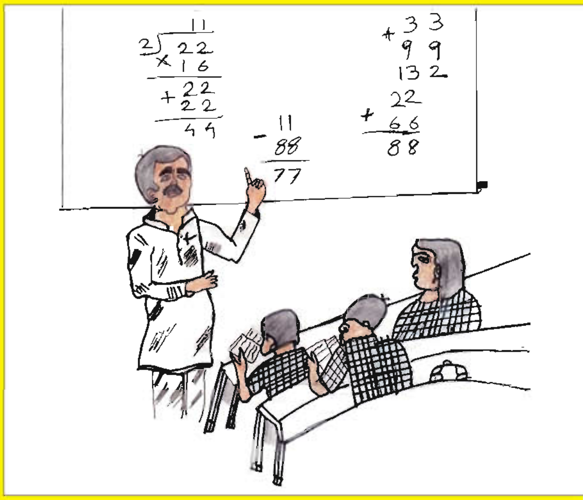

ڈرائنگ: قاضی محمد زید، درجہ 6 ڈاکٹر ذاکر حسین ہائی اسکول اورنگ آباد

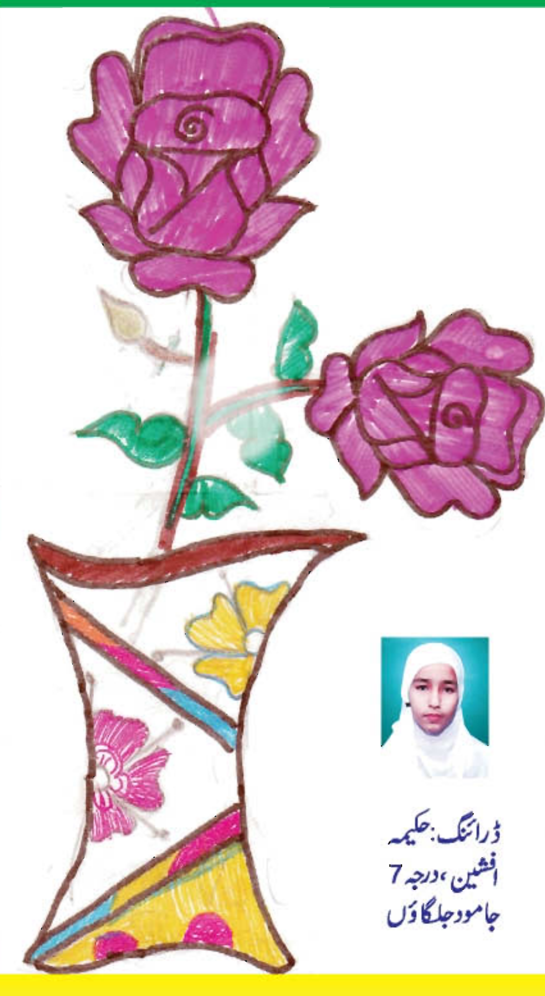

ڈرائنگ: حکیمہ افشین، درجہ 7 جامود جلگاؤں

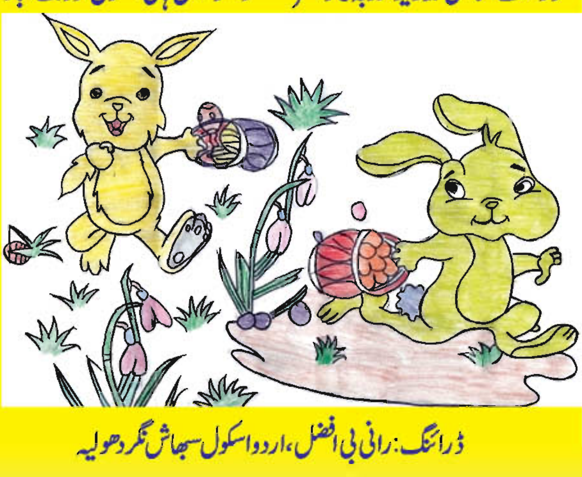

ڈرائنگ: رانی بی افضل، اردو اسکول سبھاش نگر دھولیہ

کارٹون: اسما نشاط، درجہ 9 بارسی ٹاکلی، اکولہ، مہاراشٹر

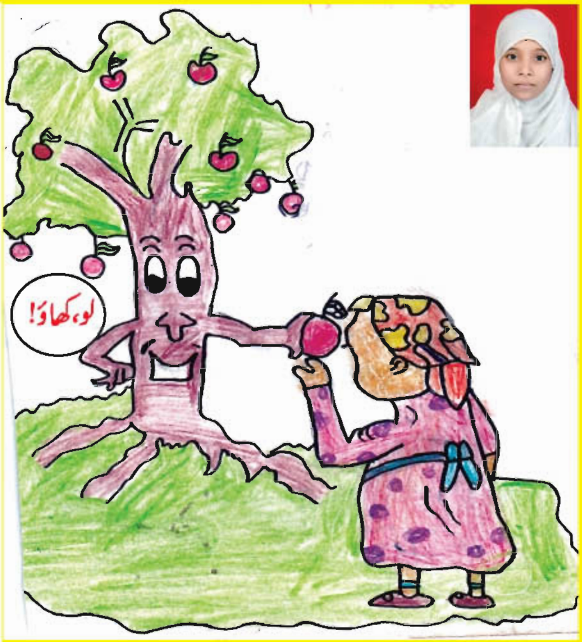

ڈرائنگ: مدیحہ ثانی، درجہ 7، جلگاؤں

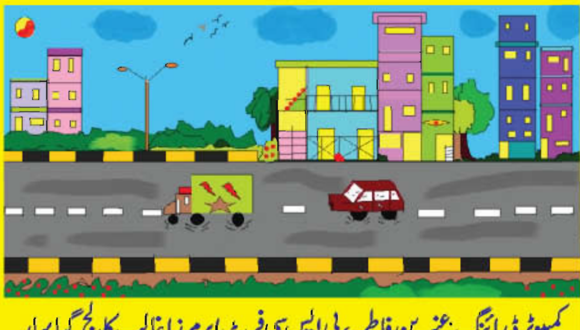

کمپیوٹر ڈرائنگ: عنبرین فاطمہ، بی ایس سی فرسٹ ایر مرزا غالب کالج گیا بہار

ڈرائنگ: اسیلہ خان، درجہ 9 ضلع بلڈانہ جلگاؤں، جامود

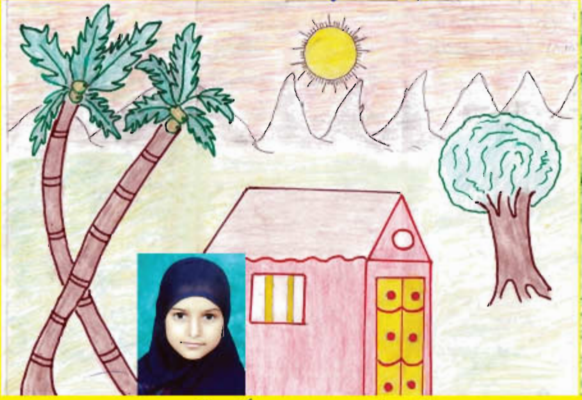

ڈرائنگ: فرحین ناز، درجہ 5 اکبر چوک دھولیہ

□ ادارہ

اردو Facebook

□ میرا نام الطاف عبدالحفیظ دلیش پانڈے ہے اور میں مولانا عبدالرزاق اینگلو اردو اسکول جلگاؤں کی 9ویں جماعت میں زیر تعلیم ہوں۔کلاس ٹیچر امجد سر ہیں ۔ میرا قلمی نام الطاف قلب الدین ہے۔اپنی نظم 'ماں' بھیج رہا ہوں، یہ میں نے محنت ومشقت سے بنائی ہے۔قبول کیجیے گا۔آپ کا ادنیٰ شاعر

الطاف قلب الدین، کانڈواروڈ، جلگاؤں، مہاراشٹر

الطاف میاں، آپ کی لکھاوٹ بہت خوب صورت ہے۔ اس میں دائروں اور نقطوں کا جس طرح خیال رکھا گیا ہے اسی طرح شاعری میں بھی رکھا کیجیے۔ شاعر بننا چاہتے ہیں تو یہ اچھی بات ہے مگر اپنی نظمیں پہلے کسی شاعری کے استاد کو دکھایا کریں، ان سے بحر اور وزن سیکھیں، اردو کی کتابیں زیادہ سے زیادہ پڑھیں ، اس کے بعد جب آپ درست شاعری کرنے لگیں گے تو ہم 'بچّوں کی دنیا' میں ضرور چھاپیں گے۔اور ہاں 'نظم بنانا' نہیں لکھتے۔لکھیے کہ 'یہ نظم میں نے محنت سے لکھی یا کہی ہے۔' ن ظ

□ رسالہ 'بچّوں کی دنیا' اردو کو اور آگے بڑھانے کے لیے نکالا گیا تھا۔ اس سے اردو کو بڑھاوا ملا ہے کیونکہ اسے بچّے اور بڑے دونوں پڑھتے ہیں۔ اسے پڑھتے ہی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم کسی اور ہی دنیا میں پہنچ گئے ہیں۔

ندیم اختر محمد عابد، چاند تارہ چوک...آگے پتہ صاف نہیں

□ میں ثانیہ ادریس 'بچّوں کی دنیا' شوق سے پڑھتی ہوں ہمارے گھر میں سبھی اردو اچھی طرح پڑھ لیتے ہیں۔آپ سب بھی اردو ضرور سیکھیں۔

ثانیہ ادریس، شاہین اسکول شاہین باغ نئی دہلی

□ میں شیخ عمیر 7ویں کلاس میں پڑھتا ہوں اور 'بچّوں کی دنیا' پڑھنے کی ترغیب ہمیں ہمارے سر نے دلائی۔ پچھلے کئی مہینوں سے بلا ناغہ پڑھتا ہوں۔ میں ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتا ہوں جہاں یہ رسالہ ہمیں ہمارے سر کے ذریعے ملتا ہے۔

شیخ عمیر، ہڈولتی، تعلقہ احمد پور ضلع لاتور، مہاراشٹر

□ میں دوسری کلاس میں پڑھتا ہوں اور مجھے اردو بھی آتی ہے۔ مجھے

اردو پڑھنا اچھا لگتا ہے۔ گھر میں بھی اردو سب کو اچھی لگتی ہے۔ میری سبھی سے درخواست ہے خود بھی اردو پڑھیں اور دوسروں کو بھی اردو پڑھائیں۔

محمد التمش منصوری، کلاس 2، شاہین اسکول شاہین باغ، نئی دہلی

□ محمد ایان سیفی بھی اسی اسکول کی دوسری کلاس میں پڑھتے ہیں، اور انھیں بھی اردو لکھنا پڑھنا آتا ہے۔ لکھتے ہیں: ''اردو پڑھنا میرا محبوب مشغلہ ہے۔''

محمد ایان سیفی، شاہین باغ، نئی دہلی

□ اسی علاقے کے کسی اسکول کی دوسری کلاس میں پڑھنے والی ثانیہ لکھتی ہیں کہ وہ اردو کے اور بھی کئی رسالے پڑھتی ہیں اور ان کے گھر میں بھی سب لوگ اردو لکھنا پڑھنا جانتے ہیں۔

ثانیہ شاہین باغ، نئی دہلی

□ پتہ نہیں کس شہر کے اسکول، جامعہ خیر النسا میں پڑھنے والی شفقہ حسن

لکھتی ہیں: ''بچوں کی دنیا کا ہر ماہ بے قراری سے انتظار کرتی ہوں اس رسالے کا ہر مضمون بہت اچھا ہوتا ہے۔ میری دعا ہے کہ 'بچّوں کی دنیا' روز بروز ترقی کی منزلیں طے کرتا رہے اور پورے معاشرے میں یہ رسالہ رائج ہوجائے۔''

شفقہ حسن، درجہ 7 جامعہ خیر النسا

❑ میں ثنا سیفی دہلی کے شاہین باغ میں رہتی ہوں۔ میں نے سب سے پہلی بار اردو اسکول میں پڑھی تھی جو مجھے بہت اچھی لگنے لگی۔ پھر میں 'بچّوں کی دنیا بھی پڑھنے لگی، جس سے مجھے بہت سی ایسی باتوں کا پتہ چلتا ہے جو پہلے معلوم نہیں تھیں۔ مجھے اردو پڑھنے کا بڑا شوق ہے۔

ثنا سیفی، F-15, 145 شاہین باغ، نئی دہلی۔

دوستو، فیس بک میں آپ کی باتیں پڑھنے میں اچھی لگتی ہیں۔ خاص طور سے جب آپ اردو زبان سے محبت کی باتیں لکھتے ہیں تو اور بھی اچھا لگتا ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کئی بار کہا ہے، کبھی کبھی اپنے گھر کے لوگوں، ابّو امّی، بھائی بہن کے بارے میں بھی لکھا کیجیے، یا گھر میں ہونے والی کسی دل چسپ بات کو ہی شیئر کرلیا کریں۔ یہ سب لکھیں گے تو 'اردو فیس بک' کا یہ کالم اور بھی مزے دار ہوجائے گا۔ آخر تصویر چھپوانا ہی تو واحد مقصد نہیں ہونا چاہیے۔ ٹھیک ہے نا! ن ظ

قلم کاروں سے اہم گزارش

- 'بچوں کی دنیا' کے لیے کہانیاں، نظمیں اور مضامین رقم کرتے وقت پانچ سے پندرہ سال تک کے بچّوں کی ذہنی و لفظی استعداد، دل چسپی اور نازک و معصوم احساسات کو ضرور ذہن میں رکھیں۔
- گنجلک اور مرکب جملوں کی بجائے عام فہم اور سیدھے سادے جملوں کے ذریعے بات کو سمجھانے کا اسلوب اپنائیں اور جہاں تک ممکن ہو مشکل الفاظ اور اضافتوں سے گریز کریں۔ انگریزی لفظ، نام یا اصطلاح کو اردو کے ساتھ انگریزی میں بھی لکھیں۔
- منظوم نگارشات میں بحر اور وزن کا پورا خیال رکھا جائے، ورنہ انھیں شاملِ اشاعت نہیں کیا جائے گا۔
- موضوعات اور تحریروں میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھیں کہ یہ رسالہ بچوں میں سماجی و تاریخی شعور کے ساتھ سائنسی مزاج Scientific Temper پیدا کرنے کو اولین ترجیح دیتا ہے، نیز یہ کسی ایک مذہبی فرقے کے بچّوں کے لیے نہیں ہے۔
- کسی بھی موضوع پر مضمون لکھنے سے پہلے مدیر یا اعزازی مدیر سے مشورہ کرلیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔
- مضمون کے آخر میں اپنا نام، پتہ، موبائل نمبر انگریزی میں بھی لکھیں اور نام وہ دیں جس سے بنک میں کھاتہ کھلا ہو۔
- اپنی نگارشات کمپوز کرکے ای میل سے بھیجیں تو اچھا ہے۔ بصورت دیگر انھیں صاف اور خوش خط لکھ کر بھیجیں۔ چاہیں تو ڈاک کی بجائے ان نگارشات کی اسکین Scan کی ہوئی نقل ای میل سے بھیجی جاسکتی ہے۔
- لکھنے کے لیے A4 سائز سے بڑا اور چھپی ہوئی سطروں والا یعنی بچّوں کی اسکولی کاپیوں کا کاغذ ہرگز استعمال نہ کریں۔ اس سے اسکیننگ میں دشواری ہوتی ہے۔
- ہاتھ کی تحریر کاغذ کے صرف ایک طرف، صاف، واضح اور پڑھنے کے قابل ہونی چاہیے اور سطروں کے بیچ جگہ ضرور چھوڑیں۔
- ہمیں بھیجی گئی نگارشات کی ایک نقل اپنے پاس بھی ضرور رکھیں۔ غیر مطلوبہ نگارشات واپس بھیجنا ادارے کی ذمہ داری نہیں ہے۔
- لفافے کو اس طرح بند نہ کریں کہ مضمون اندر سے چپک جائے۔

ادارہ

رياض انور بلڈانوی

زندگی کا نشان ہے پانی

زندگی کا نشان ہے پانی
ساری دنیا کی جان ہے پانی

زندہ ہر جان دار پانی سے
سب کو حاصل قرار پانی سے

آدمی اور پرند چوپایا
پانی دنیا میں سب کے کام آیا

یہ ضرورت ہے زندگانی کی
سب کو لگتی ہے پیاس پانی کی

کھیت پانی سے اگتے ہیں اپنے
پورے ہوتے کسان کے سپنے

اس سے سبزی اناج پھول اور پھل
اس سے شاداب وادیاں جنگل

کام کی بات یاد کرلو تم
گھر کے پانی کو صاف رکھو تم

گندہ پانی اگر پیوگے تم
جلد بیمار بھی پڑوگے تم

یوں ہی بے کار مت بہاؤ اسے
قیمتی ہے بہت بچاؤ اسے

Riyaz Anwer Buldanvi Jauhar Nagar Buldana Amravati Maharashtra

انٹر نیٹ سے

ادارہ

ہمارے ریلوے پل: 1 جموں کشمیر کے کٹرہ میں چناب پر تیزی سے بننے والا 359 میٹر اونچا لوہے کا یہ محرابی پل اگلے سال مکمل ہونے پر دنیا کا سب سے اونچا ریلوے پل ہوگا۔ 2 تامل ناڈو کے رامیشورم میں سمندر پر بنایا گیا 2 کلومیٹر لمبا رام بان پل ریلوے پل 3 ممبئی میں باندرہ اور ورلی کو جوڑنے والا 5.6 کلومیٹر لمبا یہ پل ملک کا سب سے لمبا ریلوے پل ہے 4 دہلی میں جمنا کا دومنزلہ پل جس میں اوپر ٹرین اور نیچے موٹر گاڑیاں چلتی ہیں 5 میسور میں کاینی ندی پر 1735 میں بنایا گیا ملک کا پہلا سڑک پل جو بعد میں ٹرین چلنے پر پہلا ریلوے پل بھی بن گیا!

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

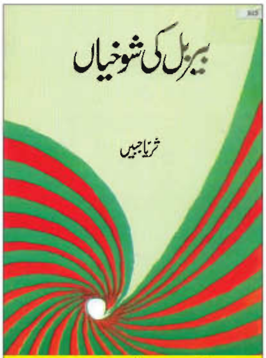

صفحات: 64، قیمت: 12 روپے

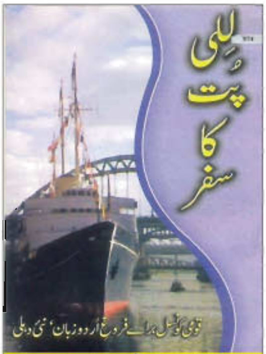

صفحات: 48، قیمت: 12 روپے

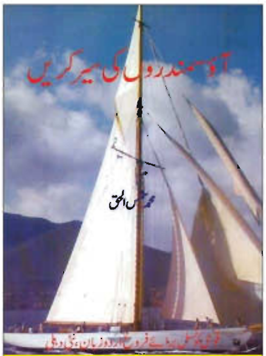

صفحات: 183، قیمت: 20 روپے

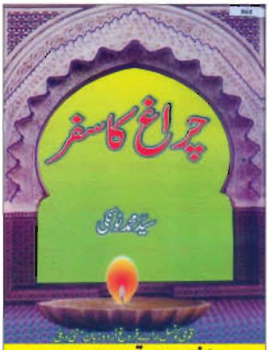

صفحات: 35، قیمت: 12 روپے

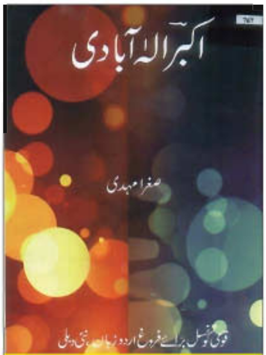

صفحات: 58، قیمت: 12 روپے

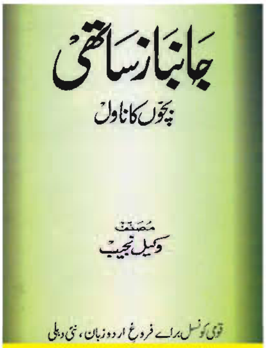

صفحات: 200، قیمت: 42 روپے

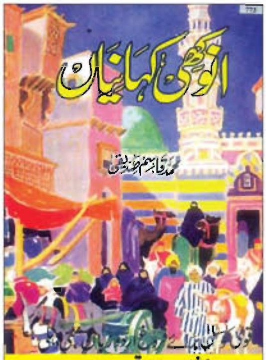

صفحات: 31، قیمت: 10 روپے

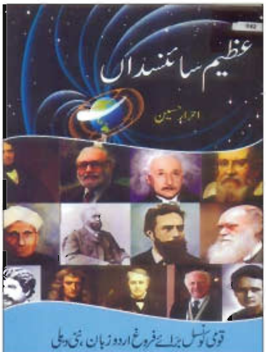

صفحات: 83، قیمت: 15 روپے

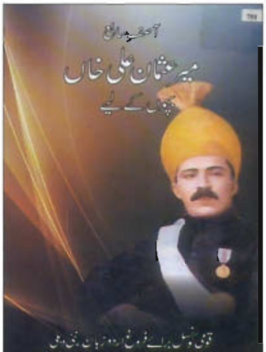

صفحات: 56، قیمت: 12 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی - 110066
فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159 E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

BACHON KI DUNIYA Monthly, June 2015, Vol. 03, Issue: 6
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. DELURD/2013/50375
DL (S) - 01/3439-2013-15
ISSN 2350-1286
Date of Publication : 11/5/15
Date of Dispatch : 12 and 13 of Advance Month

سوچھ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

بچوں کے لیے قومی اردو کونسل کی چند دل چسپ کتابیں

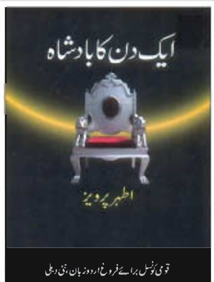

صفحات: 151، قیمت: 20 روپے

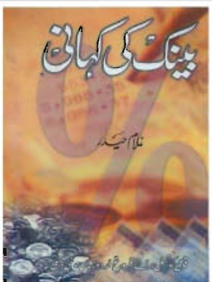

صفحات: 136، قیمت: 20 روپے

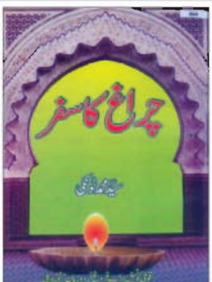

صفحات: 35، قیمت: 12 روپے

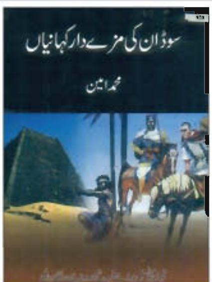

صفحات: 61، قیمت: 18 روپے

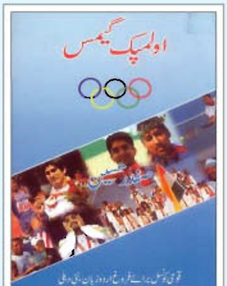

صفحات: 176، قیمت: 25 روپے

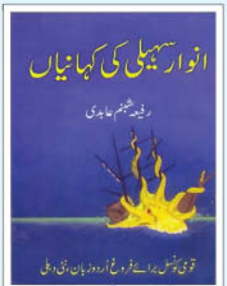

صفحات: 183، قیمت: 23 روپے

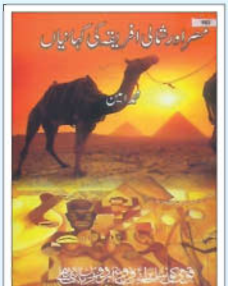

صفحات: 71، قیمت: 10 روپے

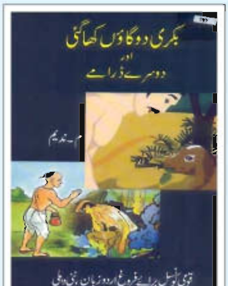

صفحات: 78، قیمت: 14 روپے

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Khwaja Md. Ekramuddin, Director, NCPUL on behalf of NCPUL, FAROGH-E-URDU-BHAWAN, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi-110025, and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area Phase-II, New Delhi-110020 on 80 GSM Art Paper produced by JK Editor : Dr. Khwaja Md. Ekramuddin, Tel : 49539000